

• اقراء صغير احمد



ان کی محبت میں اتنی سچائی اور خلوص تھا کہ نانی جان جو بہوؤں کے ناروا سلوک کے باوجود مرحومہ بیٹی کی محبت میں اسے کچھ ہفتے اپنے پاس رکھتی تھیں ان کی محبت سے مطمئن ہو کر اسے ان کے سپرد کر دیا تھا۔ کبھی وہ ان سے ملنے چلی جایا کرتی تھی۔ نانی جان کبھی مظلوم بہو تھیں اور آج بے زبان ساس تھیں۔ ایسے معصوم و بے خبر لوگ کبھی بھی حکمرانی نہیں کر سکتے۔ خاموشی سے دوسروں کی خدمت و غلامی کو شعار بنانے والے لوگوں کو کبھی ان کا حق نہیں ملتا پہلے انہوں نے سسرالیوں کی خدمت کی اب بہوؤں اور بیٹوں کی کر رہی تھیں۔ اس کے باوجود انہیں اتنا اختیار حاصل نہ تھا کہ وہ اس کو اپنے پاس رکھ سکیں۔ اس کا چند دنوں کا آنا ہی تینوں ممانیوں کے چہروں کے زاویے بگاڑ دیا کرتا تھا۔ ”دنیا میں آتے ہی منحوس ماں کو کھا گئی اب ہمارے بچوں کا حق کھانے آتی ہے۔“ بڑی ممانی جن کا تعلق امیر کبیر گھرانے سے تھا انہیں ہر لمحہ اپنے بچوں کے ”حق“ کی فکر ستائے رکھتی۔ بھجلی اور چھوٹی ممانیاں

دور غروب ہوتے سورج کی زرد زرد روشنی موسم سرما کی اس گلابی شام میں عجیب سی اداسی پھیلا رہی تھی۔ ماحول پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوا اپنے اندر بھر پور خشکی لیے ہوئی تھی۔ درمیانی سیڑھی پر وہ سر جھکائے اپنی سوچوں اور خیالوں میں گم تھی۔ نومبر کا مہینہ اس کے لیے اداسی اور وحشتوں کی سوغات لے کر آتا تھا۔ اس مہینے میں آج سے بائیس سال قبل جب اس نے دنیا میں آ کر آنکھیں کھولی تھیں اس وقت اس کی ماں کی اس طرح آنکھیں بند ہو گئی تھیں ہمیشہ کے لیے۔ اس کی آمد کا پہلا دن اس کی ماں کی زندگی کا آخری دن ثابت ہوا۔ ابتدائی چند سالوں تک وہ دادی اور نانی کی آغوش میں پرورش پاتی رہی۔ جب چھوٹی امی چھوٹے چچا کی ڈیجھ کے بعد گویہ سے کراچی تباشر کے ساتھ ہمیشہ کے لیے آ گئیں تو انہوں نے اسے بڑی چاہ سے اپنی ممتا کے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔

تو اسے ایک نگاہ دیکھنا پسند نہ کرتی تھیں۔

نانی کے مقابلے میں دادی جان بہت بارعب اور مضبوط شخصیت کی مالک تھیں۔ دادا جان کے انتقال کے بعد بھی ان کی حکمرانی اور رعب میں سرسوفرق نہیں آیا تھا۔ وہ بہوؤں، بیٹیوں اور دامادوں کو ان کے مقام پر لے کر چلنے کی عادی تھیں۔ یہ ان کی دانشمندی اور بہترین انتظامی امور کا نتیجہ تھا کہ آج تک ان کی مانی جاتی تھی۔ اس دور میں بھی ان کا خاندان یگانگت و محبت کی بہترین مثال تھا۔ چھوٹی امی نے اسے سگی ماں سے بڑھ کر محبت دی تھی اپنے اکلوتے بیٹے تاثیر سے زیادہ اسے چاہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت نرمی اور خاموش رہنے والی لڑکی ہر بات بلا چون و چرا مان لیتی تھی۔ اس کا غصہ اسے چھو کر نہیں گزرا تھا جبکہ تاثیر تو ایک طوفانِ بدخیز تھا۔ غصہ، ضد، ہٹ دھرمی و خود سری اس کی رگوں میں بہتی تھی۔ وہ اس کی شرارتیں بھی بڑی خوفناک ہوا کرتی تھیں۔ وہ بے حد موڈی تھا۔

سخت و پختہ طامی آبی روح کو شرمندہ کر ڈالتا۔ جب جہالت اس پر سوار ہوتی تو اسے اچھوں کے سکھ چھین تباہ و برباد ہو جاتے تھے۔ کسی سے ڈرنا رعب میں آتا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ دادی جان کی طرح اسے بھی حکمرانی کا شوق تھا۔ بچپن سے چھوٹے بڑے بچوں پر رعب جمایا کرتا تھا۔ مگر اس کی عنایتوں و کرم نوازیوں سے بھی وہ لوگ پورا پورا حصہ وصول کرتے تھے۔ وہ ان کا بہترین دوست، ہمدرد و پر خلوص ساتھی تھا۔ اگر دشمنی تھی تو صرف اسی سے تھی بچپن سے آج تک وہ اسے نظر انداز کرتا آیا تھا۔ اس کی محبتوں پر اس نے ڈاکا ڈالا تھا۔ اس کی ماں کو اس سے چھین لیا تھا غاصب تھی وہ۔

ایک دیوار بھی جوان ماں بیٹے کے درمیان آگئی تھی۔ اس کا خیال تھا امی ساری محبت اس پر لٹا دیتی ہیں۔ بچی بچی اس کے حصے میں آتی ہے۔ محبت میں شراکت اسے کبھی برداشت نہیں تھی۔ اس طرح وہ ہمیشہ اس کے غیظ و غضب کا شکار رہی۔ جب معصوم بھی تباہ وہ اس کی

پر چھائیں سے بھی چھپ جایا کرتی تھی۔ مگر شعور کی سرحدوں میں قدم رکھتے ہی اس کے ڈر اور خوف نے بہادری اور مقابلے کی راہ دیکھ لی۔ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف سمت چلتے رہتے۔

”خولہ! اے خولہ! کہاں گم ہو بھئی“ مغرب کی نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے اور تم یہاں مراقبے میں بیٹھی ہو..... چلو جلدی اٹھو نماز پڑھو۔“ تائبہ جو ابھی نماز پڑھ کر اسی کی تلاش میں آئی تھی۔ چھت کی سیڑھیوں پر نیم اندھیرے میں اسے بیٹھا دیکھ کر ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”تنگ مت کرو پلیر جاؤ مجھے یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔“ وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر بیزاری سے گویا ہوئی۔ ”پاگل ہو گئی ہو کیا؟ یہاں اندھیرا ہو رہا ہے اور پھر نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔“

”تم نے پڑھنا بس بہت ہے جب میرا دل چاہے گا پڑھ لوں گی۔“

”اے محترمہ! مذہب کا تعلق دل سے نہیں فرض سے ہوتا ہے ایمان سے ہوتا ہے۔ نماز کوئی اخبار یا رسالہ نہیں ہے کہ جب دل چاہا پڑھا اور جب دل چاہا چھوڑ دیا یہ وہ تعلق ہے جو سانس کے ساتھ ہی ٹوٹ سکتا ہے۔ چلو شاباش اٹھو۔“ تائبہ نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے نرمی سے سمجھایا۔

”میں سے پہلی بار دیکھ رہا ہوں اپنے نام کی طرح کام کرنے والی لڑکی کو۔“ تبارک نے نیچے والے زینے سے ہنس کر گویا ہوا۔

”کیا مطلب؟“

”تائبہ کے معنی ہیں۔ گناہوں سے توبہ کرنے والی اور تم تو دوسروں کو بھی گناہوں سے توبہ کروانے پر تکی ہوئی ہو۔“ وہ خولہ کی طرف شرارتی نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

”اس کا کریڈٹ دادی جان کو جاتا ہے جنہوں نے ہماری یہ عادت ڈالی ہے کہ ہم دوسرے کی نمازوں اور تلاوت کا خیال رکھیں اس طرح کوئی کوتاہی کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔“

تائبہ نے اسے نماز پڑھوا کر ہی چھوڑا تھا۔

”سوری اللہ میاں جی! معاف کر دینا مجھے۔ بعض اوقات شیطان بہکا دیتا ہے۔“

نماز ادا کر کے اٹھی تو اپنے بے خیالی میں کہنے لگے جملوں پر خود ہی پشیمانی سے گویا ہوئی تھی۔

☆☆☆

”مجھے لگتا ہے خبیث مر گیا آج جو ابھی تک نہیں آیا۔“ نویرا جو فجر کے بعد سے اب تک گیٹ کے درجنوں چکر لگا چکی تھی۔ جلی بکشی سی جھٹکے سے کرسی پر بیٹھ کر بولی۔

”یہ کس کو کوسا جا رہا ہے صبح ہی صبح؟“ خولہ اور تائبہ ساتھ آئی تھیں۔

”بے چارے ہا کر کی شاعت آئی ہے۔“ ٹیبل پر ناشتے کے برتن سیٹ کرتے ہوئے نمرہ نے اطلاع دی جب کہ ہادیہ کو کھٹکھٹا کر ہنس پڑی تھی۔

”تم اپنے یہ چڑیلوں جیسے دانت اندر کر لو ورنہ قتل ہو جاؤ گی میرے ہاتھوں۔“ ہادیہ کی ہنسی نے اس کی اشتعال انگیزی میں اضافہ کر دیا تھا۔

”کیا کر دیا ہا کرنے؟ کیوں اتنا غصہ کر رہی ہو؟“ تائبہ اس کے قریب بیٹھ کر بولی۔

”اس کے من پسند ناول کی آخری قسط آئی ہے اس ماہ اسے پڑھنے کے لیے ہی اس قدر بے چین ہے۔“ ہادیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کل میں نے ہا کر سے پوچھا تھا ڈائجسٹ کب آئے گا۔ اس نے کہا آج آئے گا اور صبح اخبار کے ساتھ وہ بھی ڈال جاؤں گا۔“ کل سے ایک ایک لمحہ گن گن کر گزارا ہے۔

نماز پڑھ کر باہر حن میں گئی تو اخبار تھے مگر ڈائجسٹ نہیں تھا۔

”تو ہا کر کو کیوں کوس رہی ہو جب اخبار تھے تو ڈائجسٹ بھی وہیں ہوگا۔“

”نہیں ہے میں نے کئی بار پورا صحن دیکھ لیا ہے۔ پچھلے ماہ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اٹھ بجے دوبارہ آ کر

ڈائجسٹ دے کر گیا تھا مگر اب نونج چکے ہیں۔ نہ اس کا پتہ ہے اور نہ ڈائجسٹ کا میرا دل چاہ رہا ہے اڑ کر کہیں سے ڈائجسٹ لے آؤں۔۔۔۔۔“ اس کی بے تابی و شوق جنوں حد سے سواتھا۔

”اتنی دیوان گی و بے تابی اچھی نہیں ہوتی وہ بھی ایک کہانی کے لیے۔۔۔۔۔“ ہادیہ نے سرزنش کی۔

”درست کہہ رہی ہے نمرہ اتنی گہرائی سے مطالعہ نہ کیا کرو تمہاری ہر ماہ یہی کیفیت ہوتی ہے۔ کیوں اتنا انوالو کر لیتی ہو خود کو اسٹوری میں؟“

”سب اسٹوریز ایسی نہیں ہوتیں آپ! کوئی کوئی اسٹوری میں ہمیں اپنا آپ جھٹکتا محسوس ہوتا ہے اس کے کرداروں میں ہم خود بخود شامل ہو جاتے ہیں۔ پھر اس حد تک ان کرداروں سے انسیت ہو جاتی ہے کہ ہم ان کے بغیر ادھورے محسوس ہوتے ہیں۔“

”اللہ رے اتنی حساسیت نہ معلوم تمہارا کیا بنے گا؟“

”ہادیہ تمہاری کمر پر چھٹکی۔“ خولہ نے اچانک خوف زدہ لہجے میں کہا تو ہادیہ نے دلدوز چیخ مارتے ہوئے سویٹر کی زپ کھول کر سویٹر اتار کر دور پھینکا۔

سویٹر اتارتے ہی دھپ سے دیدہ زیب ٹائٹل والا ڈائجسٹ فرش پر گر ا تھا۔ ان چاروں کی نگاہیں ڈائجسٹ پر تھیں جب کہ ہادیہ تیزی سے اپنا لباس جھاڑ رہی تھی۔

نویرا نے جھپٹ کر ڈائجسٹ اٹھایا اور ہادیہ کو گھور کر بولی۔

”چڑیل! سمجھ لوں گی تم سے ذرا یہ قسط پڑھ کر آ جاؤں۔“ وہ کہتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔۔۔۔۔ خولہ کی چالاکی ہادیہ کی اب سمجھ میں آئی تھی۔

”اس کی حمایت میں تم نے مجھ سے جھوٹ بولا؟“ وہ خولہ پر بگڑی۔

”تم بھی تو اسے اتنی دیر سے تنگ کر رہی تھیں۔“

”تمہیں محسوس کیسے ہوا کہ اس نے ڈائجسٹ چھپایا ہوا ہے؟“ نمرہ ہنس کر بولی۔

”اس کی پراسرار ہنسی اور بار بار سویٹر درست کرنے سے مجھے شک ہوا تھا۔“

”ایسے مذاق اچھے نہیں لگتے.....“ نمرہ نے اسے سرزنش کی۔

”اچھا..... پرسوں جو اس نے مجھے دادی سے ڈانٹ پڑوائی تھی جھوٹ بول کر۔“

”دادی سے ڈانٹ آج سب کھائیں گے جو مزید پانچ منٹ لیٹ ہوئے ناشتہ لگانے میں۔ چلو ہادی تم سب کو اطلاع دو ناشتہ لگنے کی ہم اتنی دیر میں میز سجالیتے ہیں۔“ خولہ اسے ہدایت دے کر آگے بڑھی تھی۔

☆☆☆

کمرے کا منظر عجیب تھا۔ تمام کزنز نویرا سے تعزیت کرنے کمرے میں جمع تھے۔ لبوں پر دہی دلی مسکراہٹوں کے ساتھ وہ اس سے تعزیت کر رہے تھے اور خود اس کا رو رو کر برا حال تھا۔ صبح سے اس نے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ صدمے اور دکھ سے اس کی بھوک پیاس مرنے لگی تھی۔

”بائے بے چارے عامر! کتنا پسند سم اور خوب صورت تھا لڑکیاں کس قدر جان دیتی تھیں اس پر۔“

”چلو اچھا ہوا مر گیا ورنہ جو لڑکیاں اس پر جان دینے سے بچ گئیں اگر وہ بھی مر جاتیں تو عامر صاحب اپنی بے زخمی و بے نیازی کے مظاہرے کس کو دکھاتے؟“

ہادی نے اس کے دکھ کو کم کرنے کی کوشش اپنے انداز میں کی۔ ”پلیز تم لوگ چلے جاؤ یہاں سے مجھے تنہا چھوڑ دو.....“ وہ چیخ کر بولی۔

”کیا ہوا؟“ خولہ جو چھوٹی امی کے ساتھ مارکیٹ گئی ہوئی تھی کمرے میں آتے ہی پریشانی سے استفسار کرنے لگی۔

”عامر مر گیا.....“ تائبہ گلو گیر لہجے میں بولی۔

”کک..... کون عامر؟“

”نویرا کے پسندیدہ ناول کا ہیرو عامر نام تھا اس کا۔“ انہیں ہنسی ضبط کرنا دشوار تھا۔

”اوہ یہ نویرا اس کے لیے رورہی ہے؟“ وہ حیرانی سے نویرا کی طرف بڑھی۔

”ہاں۔“ اس بار کورس میں ان کے قہقہے گونجنے لگے تھے

جبکہ خولہ نے نویرا کی حساس طبیعت کو جانتے ہوئے انھیں زبردستی کمرے سے نکالا اور دروازہ اندر سے لاگ کر کے اس کے قریب بیٹھ گئی جو گھٹنوں میں منہ چھپائے رونے میں مصروف تھی۔

”یہ کیا بے وقوفی ہے؟ کیوں اپنا مذاق بنواتی ہو؟ فرضی کردار کی موت پر کیوں اپنی آنکھوں کے سچے موتی لٹا رہی ہو۔ کہانیوں میں ایسا تو ہوتا رہتا ہے۔“ اس نے بہت پیار سے چہرہ اونچا کر کے اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے سمجھایا۔

”تین سال سے اس ناول کو پڑھ رہی تھی۔ اتنے عرصے میں کرداروں سے محبت ہو ہی جاتی ہے۔“

”اچھا چھوڑو چلو آؤ ہاتھ منہ دھوؤ“ میں چائے کے ساتھ کچھ لائی ہوں.....“ وہ اسے ہاتھ روم کی طرف دھکیل کر کمرے سے نکل گئی.....

رات سے خوب سردی میں اضافہ ہو گیا تھا تیز ہواؤں میں برف کی ٹھنڈک کھلی محسوس ہو رہی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ کچن کی صفائی میں لگ گئی چھوٹی امی جوڑوں کے درد کی بیماری میں مبتلا تھیں۔ سردیوں میں یہ بیماری اتنی شدید ہو جاتی کہ وہ چلنے پھرنے سے معذوری ہو جاتی تھیں۔ ایسے میں کام کا تمام بوجھ اس پر آ جاتا تھا جو وہ خوش اسلوبی سے نبھایا کرتی تھی۔ ویسے تو سب مل جل کر رہتے ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ مگر چھوٹی امی کے ذاتی کام کسی اور سے کروانا اسے بالکل پسند نہ تھا۔

پچھلے دو ماہ سے نانی سے ملنے نہ جاسکی تھی۔ آج کل ان کی یاد بڑی شدت سے آرہی تھی۔ اس گھر میں اسے بہت پیار ملا تھا۔ مگر شاید ہر رشتے کی محبت کا لمس جدا ہوتا ہے۔ چھوٹی امی نے اسے ماں سے بڑھ کر پیار دیا تھا تو دادی کی چاہت کی کوئی حد ہی نہیں تھی مگر پھر بھی نانی جان کے سینے سے لگ کر اس کے اندر ایک اطمینان و سکون کا احساس جاگ اٹھتا تھا۔ ان کے وجود سے ایک ایسی مہک اٹھتی تھی جو اس کی وحشتوں کو سکون دیتی تھی۔ بے کل

جائے گا مجھے۔“ وہ کون سا اس کے ساتھ جانے کو مری جا رہی تھی۔ تیزی سے اس کی بات قطع کر کے بولی۔

”اؤنہ! وہ تو ہے ہی خدمت گار.....“ وہ بڑبڑایا۔ خولہ سنی ان سنی کرتی ہوئی کچن میں اس کے لیے ناشتہ لینے چلی گئی کہ لمحے بھر کی بھی دیر ہوئی تو باتیں بنائے گا۔

”اف! اس گھر میں کوئی کام پورا تو ہوتا ہی نہیں ہے۔“ وہ ناشتہ لے کر آئی تو اس کی غصے بھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اور فوراً ہی اسے یاد آیا کہ پریس کرتے وقت اس کے کالر کا بٹن نکل گیا تھا اور اسی وقت بٹن لگانے کے لیے وہ سوئی دھاگہ بھی لے آئی تھی مگر امی کے آواز دینے پر وہ گئی تو بعد میں یاد نہ آیا۔

”کیا ہوا بیٹے! کیوں غصہ کر رہے ہو؟“

”کالر کا بٹن غائب ہے۔“

”اس میں اتنا غصہ ہونے کی کیا بات ہے لاؤ میں لگاؤں۔“

”اپنی لاڈلی کو کچھ مت کہئے گا جس سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ میں نے کتنی مرتبہ کہا ہے میری ہر چیز پہلے سے تیار رکھا کرو۔ اور یہ بٹن وغیرہ تو پہلے دیکھنے چاہئیں۔ میں تنخواہ دار آدمی ہوں ایک سوٹ کو کئی بار پہننا ہوتا ہے۔ کوئی لینڈ لارڈ نہیں ہوں جو ایک دفعہ کے بعد دوبارہ سوٹ استعمال نہیں کروں گا۔“ وہ حسب عادت شروع ہو گیا۔

”خاموش رہو..... اس قدر کام کرتی ہے بچی! اگر کچھ رہ جائے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ تمہیں تو عادت پڑ گئی ہے ذرا ذرا سی بات پر اس غریب کے قصے سننے کرنے کی۔“ انہوں نے عدل پسند طبیعت کے باعث انصاف کی بات کی۔ خولہ نے خاموشی سے سوئی دھاگہ اور بٹن اٹھایا اور اس کے قریب آ گئی۔

”لا دیں شرٹ دیں۔“

”ایسے ہی لگا دو اب میں تمہارے لیے شرٹ اتارتا رہوں؟“ اس نے قریب آ کر خاموشی سے بٹن لگانا شروع کیا۔ بٹن کالر کا تھا۔ قد اس کا گھر میں تمام لڑکیوں

اور بے چین قلب کو چند لمحوں کے لیے شانت کر دیا کرتی تھی اور یہ لمحے اسے اپنی زندگی کا حاصل لگتے تھے۔ چھوٹی امی کی یہ بے ریا محبت ہی تھی جو وہ اس کے چہرے کے رنگوں سے اس کی خواہشوں اور احساسات کو جانچ لیا کرتی تھیں۔ انہوں نے کہا بھی تھا کہ وہ نانی سے مل کر آ جائے بہت دن ہو گئے ہیں اسے ان سے ملے ہوئے۔ مگر ہر بار وہ ان کی وجہ سے مسکرا کر مثال گئی تھی۔

”خولہ! آج خالہ (نانی جان) کے ہاں چلی جاؤ کافی ہفتے ہو گئے ہیں۔ وہ بھی انتظار کر رہی ہوں گی میری طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے پھر بچیاں چکر لگاتی رہتی ہیں۔ دونوں بھابھیاں بھی کام سے فارغ ہو کر آ جائیں گی.....“ وہ ان کی چوٹی باندھ کر اٹھی تو انہوں نے بڑی شفقت سے کہا۔

”چلی جاؤں گی مگر کچھ دن بعد۔ آپ کی طبیعت ذرا اور بہتر ہو جائے۔“ اس نے ان کے نزدیک بیٹھ کر کہا تو فرط مسرت سے انہوں نے اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

”میں بہتر ہوں میری جان! میری فکر مت کرو میں جانتی ہوں تمہارا بھی دل چاہ رہا ہے وہاں جانے کو مگر میری وجہ سے برداشت کر رہی ہو۔ جاؤ تیار ہو جاؤ۔“

”امی جان! آپ کو کبھی غیروں کے نازخوئے اٹھانے سے فرصت ملے تو ایک آدھ نظر عنایت اس بد نصیب پر بھی ڈال لیا کیجئے۔“ تباشر ناول سے بال رگڑتا ہوا آیا تو وہاں کا منظر دیکھ کر منہ بنا کر بولا۔ ایسے مناظر اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے جس میں اس کی ماں اس سے زیادہ اس بد تمیز لڑکی پر چاہت لٹاتی نظر آتیں بچپن سے باشعور ہونے تک اسے یہی شکایت رہی تھی کہ امی اس سے زیادہ اس لڑکی کو محبت دیتی ہیں۔

”ماشا اللہ اونٹ جیسا قد ہو گیا ہے مگر بچپنا نہیں گیا تمہارا۔ ناشتہ کر لو۔ آفس جاتے ہوئے خولہ کو نانی کے ہاں ڈراپ کرتے ہوئے جانا۔“ وہ مسکرا کر بولیں۔

”سوری امی! آج مجھے جلدی آفس جانا ہے اور.....“

”کوئی بات نہیں فیضان کو فون کر دوں گی وہ آ کر لے

سے کمرے میں چلی آئی تو پیچھے پیچھے تاثیر بھی چلا آیا۔
”جلدی واپس آ جانا“ کہیں رگ جاؤ جا کر امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”مشورے کا شکریہ..... مجھے احساس ہے کہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

اس سے بات کرتے وقت اس کا لہجہ ایسا ہوتا تھا جیسے کوئی شہنشاہ اپنی ادنیٰ کنیز کو بڑی حقارت سے حکم دے رہا ہو۔ یہی بات اسے سلگا کر رکھ دیا کرتی تھی۔

”واہ تمہارے احساسات کے کیا کہنے۔“ وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا اور اس نے آگے بڑھ کر زوردار آواز میں دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

نانی جان بہت پر جوش انداز میں اس سے ملیں۔ کافی دیر تک اسے سینے سے لگا کر بیٹھی رہیں اپنی کمزور لرزتی انگلیاں دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں پھیرتی رہیں۔ فروا فردا گھر کے لوگوں کا احوال پوچھنے لگیں۔

”بہت یاد آ رہی تھی تمہاری مگر میں جانتی تھی ان دنوں آصفہ کی تکلیف میں اضافہ ہو جاتا ہے اس لیے تمہیں بلوایا نہیں مگر رات سے طبیعت اس قدر گھبرا رہی تھی کہ میں نے فیضان سے کہہ کر تمہیں بلوایا.....“ انہوں نے سوہن حلوہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”چھوٹی امی تو کئی بار اصرار کر چکی تھیں مگر مجھے اچھا نہیں لگا انہیں تکلیف میں چھوڑ کر آنا آج بھی وہ کہہ رہی تھیں کہ فیضی پہنچ گیا.....“ اس نے مزے سے حلوہ سوہن کھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں اللہ خوش رکھے اس کو بہت خیال رکھتا ہے میرا ورنہ گھر والوں کے لیے تو میرا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ تمہاری ممانی نے دونوں بیٹیوں کی بات پکی کر دی ہے کئی بار ان کے سرال والے آئے ہیں مگر مجال ہے جو ایک بار بھی مجھے ان سے ملایا ہو.....“

ان کے آزدہ لہجے میں گھر کی بزرگ ہونے کے باوجود نظر انداز کر دینے کا دکھ بول رہا تھا۔

سے اونچا تھا مگر اس کے مقابل کالر میں مٹن لگانے کے لیے اسے ایڑیوں کے بل کھڑا ہونا پڑا تھا۔ وہ ایسے اکڑا کھڑا تھا گویا اس کی سات پشتوں پر احسان عظیم کر رہا ہو البتہ گاہے بگاہے نگاہیں اس کے کچھ نروس چہرے پر بھی ڈال لیتا تھا۔ پہلی دفعہ وہ اس کے اس قدر قریب کھڑی تھی۔ عجیب بوکھلائی گھبرائی، جھنجھلائی جھنجھلائی سی۔ اس کی سانسوں کی گرماہٹ وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ ایک دم ہی اس نے ناک پر ہاتھ رکھ لیے تھے جب اس نے حسب عادت دانتوں سے دھاگہ توڑا تھا۔

”اوف.....! تم دانت برش نہیں کرتیں؟ تو بہ کس قدر بو آ رہی ہے۔“ اس نے شکرے کے طور پر تضحیک آمیز طنز مارا تھا۔

”بومیرے دانتوں سے نہیں آپ کے کڑوے مزاج سے آ رہی ہے سمجھے۔“ وہ بھی اسی انداز میں بولی۔

”چھوڑو بیٹی کیوں خون جلاتی ہو اس کی تو عادت ہے فضول بکواس کی۔ تم جلدی سے فیضان کو فون کر کے تیار ہو جاؤ جب تک وہ آئے گا تمہاری تیاری ہو جائے گی۔“ امی نے ہمیشہ کی طرح اس کا جھنڈا لہرایا تھا۔

ای خاموشی ہی ہوئی تھیں کہ فیضان سلام کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی تاثیر آہستگی سے بڑھایا۔

”نام لیا اور شیطان حاضر.....“ اس نے جھک کر چائے بنانی خولہ کو بطور خاص بتایا۔

”آؤ..... آؤ بیٹا! ماشاء اللہ عمر دراز ہے تمہاری ابھی میں تمہارا ہی ذکر کر رہی تھی۔“ امی نے سلام کے جواب میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

”جی آئی! جودل سے نکارتے ہیں تو دل کو خبر ہو ہی جاتی ہے۔“ وہ کٹکھوں سے خولہ کی جانب دیکھتا ہوا تاثیر سے ہاتھ ملانے لگا۔ تاثیر نے اسے ناشتے کی آفر کی تھی۔ لیکن ناشتہ وہ کر کے آیا تھا اس لیے صرف چائے پی گئی تھی اس نے۔

”دادی جان بہت یاد کر رہی ہیں خولہ کو انہوں نے اسے لینے کے لیے بھیجا ہے۔“

”ہاں لے جاؤ بیٹی جلدی تیار ہو کر آ جاؤ۔“ خولہ وہاں

”نانی جان! کیوں دکھی ہوتی ہیں۔ ان کے رویے تو شروع سے ہی ناروا ہیں۔ بڑوں کا احترام کرنے کی تربیت ممائی جان کو اپنے گھر سے حاصل نہ ہوئی اور نہ ہی انہوں نے اپنے بچوں کو تمیز و آداب سکھائے فیضان کسی کی دعا سے بچ گیا۔“

بہر حال وہ آج جو بورہی ہیں وہی کل کا ٹیس گی اس دنیا میں مکافات عمل بہت جلد شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں زیادہ قصور ماموں کا ہے جنہیں ماں کی فکر اور آخرت کا خیال ذرا بھی نہیں ہے۔“

”میں سوچتی ہوں کسی کو برا کیوں کہوں۔ اس وقت کا چلن ہی کچھ بے حسی و بے مروتی کا ہے۔“

”نانی جان!“ قصور وقت کا نہیں ہوتا انسانوں کے احساسات کا ہوتا ہے۔ ہم کیوں وقت کو دوش دیتے ہیں۔ میں نے قدرت کے اصولوں کو بدلتے ہی نہیں دیکھا آتے جاتے موسم ڈھلتے ابھرتے دن رات چمکتے دھمکتے چاند سورج انسان کی پیدائش و موت سب اسی طرح نظام قدرت رواں دواں ہے ہمیں کوئی کمی بیشی نہیں ہے۔

یہ تو انسان کے اپنے اغراض و مقاصد ہوتے ہیں جن کے حصول کے لیے وہ کتے کی طرح بااگر پاؤں چاٹتے ہیں تو مطلب براری کے بعد توتے کی طرح آنکھیں بدل لیتے ہیں۔“

”چھوڑوان باتوں کو میں بھی بے وقوف ہوں کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔“ اسے افسردہ دیکھ کر انھیں احساس ہوا کہ وہ اتنے عرصے بعد آئی ہے تو کوئی اچھی بات کرنا چاہیے۔

”میں نے محسوس کیا ہے جو کمزور بہو ہوئی ہے وہ کبھی مضبوط ساس نہیں بن سکتی آپ اپنا منصب سنبھال کر ان بہوؤں کو ان کی اوقات پر رکھیں تو آج آپ اپنوں کے ہوتے ہوئے اس تنہائی و بے قدری کا شکار نہیں ہوتیں۔“

اسے ان کا اتر کمرہ دیکھ کر غصا رہا تھا۔ ڈھیروں ملازمین کی موجودگی میں ان کا کمرہ گرد آلود ہو رہا تھا۔ سنگل بیڈ پر کچھی چادر اور تکیے پر چڑھا غلاف میلا تھا نیچے کارپٹ پر دھول دائرے بنا چکی تھی۔ ملازم بھی مالکوں کے مزاج

دیکھ کر کام کرتے ہیں۔ گھر والوں کی عدم دلچسپی و لاپرواہی نے ان کے حوصلوں کو بھی ہوا دی تھی۔

”جا کر ممائی کو سلام کراؤ ورنہ ناراض ہوں گی کہ ملنے بھی نہیں آئی۔۔۔۔۔“ انھیں خیال آیا۔

”ان کی ناراضگی کی آپ پروا کرتی رہیں مجھے نہیں ہے۔ انھیں کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ فون کر کے خیریت معلوم کر لیں کہ اتنے عرصے سے آ کیوں نہیں رہی۔“

”جب برے لوگ اپنی برائی ترک نہیں کرتے تو ہم کیوں ان کی خاطر اپنی اچھائی چھوڑیں۔“ انہوں نے ملائمت سے اسے سمجھایا تو ان کے خیال سے وہ اندر ممائی

اور ان کی دونوں بیٹیوں سے ملنے چلی گئی مگر ملازمہ سے معلوم ہوا کہ وہ تینوں ماں بیٹیاں کہیں باہر گئی ہوئی ہیں اور ان کی واپسی کا کچھ معلوم نہیں۔ ملاں کی گہری لہر اس کے اندر تک اتر گئی یہ سوچ کر کہ انہوں نے نانی جان کو مطلع

تک کرنا گوارا نہیں کیا تھا اور نانی کو یہ خوف تھا کہ کہیں بہو اور پوتیاں اس بات پر ناراض نہ ہو جائیں کہ نواسی نانی کے پاس پہلے پہنچ گئی۔ انھیں سلام تک نہ کیا۔

”کیا ہوا؟“ اسے اٹنے قدموں واپس آتے دیکھ کر نانی نے استفسار کیا۔

”وہ کہیں باہر گئی ہیں۔“ اس نے وارڈوب سے دھلی ہوئی بیڈ شیٹ نکالتے ہوئے کہا۔

”ہاں بھئی اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ یہی احسان کیا کم ہے کہ انہوں نے مجھے اپنے گھر میں بٹھا رکھا ہے ورنہ دونوں چھوٹی بہوؤں سے تو یہ بھی توقع نہیں ہے بیٹیوں کو تو

میں یاد ہی نہیں۔“ اس نے حیرت سے نانی کو دیکھا جن کے لہجے میں طنز نہیں ممنونیت تھی۔

”آپ کی اسی سادگی نے تو آپ کو یہ مقام دلایا ہے۔ ورنہ یہ گھر تو آپ کا ہے اگر آپ یہاں رہتی ہیں تو کسی پر

بوجھ نہیں ہیں۔ ماموں کو اپنے بڑس سے فرصت ملے تو کسی کی خبر لیں سال میں دس مہینے ان کے فارن ٹورز میں گزرتے ہیں۔ تو بقیہ دو ماہ بڑس مسائل کو سلجھانے

میں..... بیڈ سے میلی چادر اتار کر وہ دھلی ہوئی چادر بچھاتے ہوئے بولی۔

”تم آ کر کن دھندوں میں لگ گئی ہو؟ یہاں آ کر بیٹھو۔“
”آپ ظہر کی نماز پڑھ لیں میں اتنے میں کمرے کی صفائی کر لوں گی پھر کھانے سے فارغ ہو کر نماز ادا کر لوں گی۔“ وہ تکیے پر غلاف چڑھاتے ہوئے بولی۔

”رضوان کا فون آیا تھا؟“ انہوں نے آہستگی سے دریافت کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ کمرے میں یک دم ہی کھسیر خاموشی چھا گئی.....

”مصرف ہوگا بیوی بچوں میں پھر باہر رہنے والوں کو سخت محنت کرنی پڑتی ہے جب کہیں جا کر دو پیسے کماتے ہیں۔“ اس خاموشی کو ان کی آواز نے توڑا۔

”کروڑ پتی بیوی سے شادی انہوں نے دو پیسے نہیں کروڑوں کمانے کے لیے کی تھی۔ ان جیسے مردوں کو محنت کی عادت نہیں ہوتی۔“ اس کے لہجے میں نفرت تھی۔

”بری بات اس طرح نہیں کہتے باپ سے وہ تمہارا۔“
”پلیز نانی جان! میں ان کا نام سننا پسند نہیں کرتی ان کے ہوتے ہوئے میں یتیموں کی طرح رہ رہی ہوں۔“ بمشکل اس نے اپنے آنسو ضبط کیے تھے۔

نانی جان کے نماز سے فارغ ہونے تک وہ بھی کمرے کی صفائی سے فارغ ہو گئی تھی۔

”چلو کچن میں چل کر دیکھتے ہیں کیا پکا ہے۔“ نانی اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے بولیں۔ اسی دم فیضان کمرے میں داخل ہو کر بولا۔

”خولہ کی پسندیدہ تمام ڈشز میں ہوٹل سے لے آیا ہوں خیرن نیمل پر لگا رہی ہے۔ آپ لوگ چلیں بہت سخت بھوک لگی ہے۔“

”کتنا دکھ ہوا ہے مجھے یہاں نانی جان کی حالت دیکھ کر تم سمجھتے ہو ان کا معمولی سا خیال رکھ کر تم اپنی ذمہ داری سے عہدہ ہٹا ہو گئے؟“ کھانے سے فارغ ہو کر اس کی فرمائش پر وہ کافی بنانے کچن میں آئی تو فیضان سے کہنے لگی۔

”کیا ہوا پارٹنر؟ خاصی ناراض لگ رہی ہو۔“
”اونہ۔ مجھے کہاں حق پہنچتا ہے تم سے ناراضی ہونے کا۔“

”میں تو اپنے سارے ”حقوق“ تم کو سونپنے کو راضی ہوں مگر تم ہی.....“

”شٹ اپ! میں سنجیدہ ہوں کتنے افسوس کی بات ہے جس گھر میں ملازمین کی تعداد گھر کے افراد سے زیادہ ہو وہاں ایک معمر خاتون کے کمرے میں گرد و زیرہ ڈال لے۔ چھوٹے سے کمرے میں بے ترتیبی ہو گند پھیل جائے اور کسی کو پروا بھی نہ ہو۔“ گھر سے باہر جاتے وقت کسی کو اجازت مانگنا تو درکنار مطلع تک کر کے جانے کی توفیق نہیں ہوتی کتنے دکھ اور بے حسی کا مقام ہے کس طرح یہ لوگ نانی جان کے صبر اور شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔“

”بد نصیبی و سیاہ بختی ہے ان لوگوں کی میں شرمندہ ہوں کہ داوی حضور کی اس طرح کیس نہ کر سکا جس طرح کرنا چاہیے تھی مگر تم بے فکر ہو میں آج ہی سے ایک ملازمہ مکمل طور پر ان کے پاس بھیج دوں گا اب تو خوش ہونا۔“ اس نے غصائیت سے مسکرا کر دریافت کیا۔

”ہوں تم سچ مجھ بہت اچھے ہو فیضی!“
”بھینکس گاڈ!..... تم نے اقرار تو کیا.....“ اس کی شرارت پر وہ بھی مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

”نوریا! آج چائینز لے کر چل رہی ہونا ڈنر کروانے؟“ تائبہ نے سنجیدگی سے اس سے پوچھا جو تیسرے دن خود کو نارمل کر پائی تھی۔

”کیوں؟ کس خوشی میں؟“

”خوشی میں کیوں؟ غمی میں کہو..... بھی یاد کرو آج تمہارے پسندیدہ ناول کے ہیرو کا سوئم ہے۔ کیا اس کے لیے ایصال ثواب نہیں کرو گی اور آج اس کے سوئم کا کھانا نہیں کھلو آؤ گی.....“ وہ حیرانی سے آنکھیں پینا کر بولا۔

”بکو اس نہیں کرو۔“ وہ غصے سے کھول کر بولی۔

”وہی بے پناہ کاروباری مصروفیات کی مجبوریاں۔“
 ”صاف صاف نہیں کہتے کہ اس چڑیل کے چنگل
 سے آزادی نہیں ملتی۔“

”رضوان کے لیے ایسی عورت ہی ٹھیک ہے۔
 اگر ہوتی سحرش کی طرح بے زبان اور دبو قسم کی تو اس کی
 طرح کب کی قبر کی آغوش میں چھپ چکی ہوتی نہ معلوم
 کس کی بری صحبت میں اس نے کم عمری میں ہی غلط
 راستوں کا انتخاب کر لیا تھا۔ خراب عورتوں سے تعلقات
 جو اور شراب نوشی کی لت تو اسے ایسی لگی تھی کہ شادی کے
 ایک ماہ بعد ہی سحرش کے تمام طلائی زیورات فروخت
 کر ڈالے تھے۔ اماں نے تو بہت ڈھونڈ کر اس کے لیے
 سحرش جیسی حسین و جمیل لڑکی کا انتخاب کیا تھا کہ کم عمر اور
 حسین ترین بیوی کی موجودگی میں وہ سب خراب راستے
 چھوڑ دے گا۔ مگر ایسے عیاش آدمی کے لیے حسین ترین
 کے بجائے چالاک اور مکار عورت بہتر رہتی ہے۔ ایک
 دن بھی سحرش کو اس نے محبت نہ دی۔ شادی کے چند دنوں
 بعد ہی تو وہ اپنے باس کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ میں
 دلچسپی لینے لگا تھا۔ خولہ کی پیدائش سے ایک ماہ قبل ہی اس
 بیوہ سے شادی کر کے اس کے دونوں بچوں سمیت جاپان
 چلا گیا تھا۔“

”ہاں۔ آج بھی وہ وقت یاد آتا ہے تو
 آنکھیں بھر بھر آتی ہیں۔ کتنی چاہ تھی سحرش کو اپنی بیٹی
 دیکھنے کی مگر افسوس شوہر کی بے وفائی و بے وقعتی نے
 اسے اندر سے کھوکھلا کر ڈالا اور وہ اپنی بیٹی کو دیکھے بنا ہی
 اس دنیا سے منہ موڑ گئی۔“

میری ماں کی کوکھ سے ہی تو مجھے بے وقعتی ادا ہی اور
 دشتوں کے احساسات ملے ہیں۔ وہ بھی شاید اسی طرح
 سب کی چاہتوں کے باوجود سب کی موجودگی میں خود کو تنہا
 و حقیر محسوس کرتی ہوں گی کیونکہ جس شخص سے منسوب
 ہو کر وہ یہاں آئی تھیں اس شخص نے ہی اپنی بے اعتنائی
 سے انھیں بے وقعت کر ڈالا تھا مجھے اور میری ماں کو دکھ
 دینے والا ایک ہی شخص ہے رضوان حسین..... جس کی

”بکواس کی کیا بات ہے پرسوں سے تم نے رورو کر جو
 آنکھیں سجالی ہیں۔“
 ”جو تے کھانے میں تو کہو۔“

”یہ ڈش تمہارے ہیرو عامر کی پسندیدہ تھی میری
 نہیں۔“ وہ ہنس کر کہہ اٹھی۔

”تمہارا سوگ کب ختم ہوگا؟ گھر میں تھوک کے
 حساب سے کام پڑے ہیں۔ اور تمہیں فکر ہی نہیں ہے
 کوئی۔“ ہادیہ اسے فارغ دیکھ کر تپ کر بولی۔

”کر رہی ہوں کام..... تمہیں ہر وقت میری فکر رہتی
 ہے کہ کہیں میں آرام تو نہیں کر رہی۔“ وہ غصے سے کہتی
 ہوئی باہر نکل گئی۔ ہادیہ نے تاجہ کی پروا کیے بغیر کمرے کی
 صفائی شروع کر دی۔

”اے..... اے جمعہ دینی! کم از کم کام کرنے سے
 قبل آنکھیں تو کھول لیا کرو۔“

”تمہاری آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں نا۔“ وہ اس کے
 آگے جھاڑو لہرا کر بولی۔

”جب تمیز بٹ رہی تھی تو نہ معلوم تم کہاں تھیں۔“ وہ
 بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

☆☆☆

صحن میں نرم نرم دھوپ اتر آئی تھی جو سرد موسم میں بہت
 بھلی لگ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر ستونوں سے لپٹی سبز بیلوں
 میں کھلتے سرخ پھولوں کو دیکھتی رہی۔ آج پھر وہ اداسیوں
 کے گھیرے میں تھی دل و دماغ پر کبھی جم گئی تھی۔

اپنا وجود پھر بے مصرف لگ رہا تھا۔ ”بھلا کیا ہو جاتا
 اگر اس دنیا میں میں نہ آتی تو روز یہاں سینکڑوں لوگ دنیا
 چھوڑ جاتے ہیں ان کے جانے سے دنیا کے معمولات
 میں کوئی فرق نہیں پڑتا پھر میرے نہ ہونے سے دنیا
 میں کوئی کمی تو نہ ہوتی۔“ اس نے گھٹنوں میں چہرہ چھپاتے
 ہوئے یاسیت سے سوچا۔

”کل رات رضوان کا فون آیا تھا۔“ بڑی امی چھوٹی
 چچی سے مخاطب تھیں۔

”اچھا..... اتنے عرصے بعد خیال آیا؟ کیا کہہ رہے تھے؟“

برداشت کرتا ہوں اپنی محنت کی حلال کی کمائی سے.....
وہ پیدا آئی منہ پھٹ و تکلیف وہ حد تک صاف گوتھا۔
اس کا سارا غصہ و غلطی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ سچ جس
قدر کڑوا ہوتا ہے اس قدر ہی باوزن بھی۔ اس کا طعنہ
سناتے تیر کی طرح اس کے قلب میں پیوست ہو گیا تھا۔
یہ حقیقت تھی کہ کروڑ پتی باپ کے ہوتے ہوئے وہ
اس مغرور اور بد دماغ کے ٹکڑوں پر پل رہی تھی۔ پھر اسے
کسی اعتراض کا حق کہاں حاصل تھا۔

وہ ایک دم ہی خاموش ہو گئی تھی۔ بے آواز آنسو گلابی
رخساروں پر موتیوں کی طرح چمکنے لگے تھے۔ تابشیر نے
گہری نگاہوں سے اس کے بکھرے بکھرے بالوں کے
درمیان گلابی چہرے کو دیکھا تھا اور اس کے نہ چاہنے کے
باوجود آنسو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکے تھے.....
وہ طمانیت سے سیٹی بجاتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆

شام کی چائے پر ان سب لڑکیوں نے مل کر خوب
اہتمام کیا تھا.....

گھر میں خوب محفل جمی ہوئی تھی بڑی امی کی تینوں
بیٹیاں شمرہ، یسرہ، شیبہ اپنے بچوں سمیت چند دن کے لیے
رہنے آئی تھیں۔ چھوٹی چچی کی بیٹی سویرا جس کی شادی چھ
ماہ قبل ہوئی تھی وہ بھی آئی تھی۔ کافی دل گرفتہ اور پریشان
پریشان سی۔

تین چار ماہ قبل تو بہت مسرور اور شاداں و فرحاں سی وہ
میکے آئی اور سسرال جاتی تھی شادی کے اولین دن تھے۔
پیار و محبت، یگانگت و خلوص کے پھولوں کی مہکار ہر طرف
ہی محسوس ہوتی تھی۔ شوہر اس کا دیوانہ تھا تو ساس نندیں
جان چھڑکتی تھیں۔

مگر جان چھڑکنے اور دیوانگی کا یہ وقفہ بہت مختصر ثابت
ہوا اور کھیر پکاتے ہی ان کے مزاجوں پر چڑھی قلعی خود ہی
اتر گئی۔ اب ان کی بد مزاجی و بد صورت رویوں کی زد میں
وہ مسلسل تھی۔ شوہر بھی ماں کی شان میں کوئی گستاخی
کر کے اپنی عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سو ہر وقت

بے رخی و سنگدلی کا شکار ہو کر اس کی بیوی شادی کے دسویں
ماہ میں ہی دنیا چھوڑ گئی تھی اور اب ماں کی سزا بٹی کاٹ
رہی ہے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ تانی اور چچی کی گفتگو بخوبی
اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

”اماں کہنے لگیں بیس سال ہو گئے یہاں سے گئے
ہوئے آ کر ایک پار شکل تو دکھا جاؤ تو معلوم ہے کیا
جواب ملا؟“

”ہاں..... کیا جواب دیا رضوان بھائی نے؟“ چچی پر
اشتیاق لہجے میں پوچھنے لگیں۔

”کہنے لگے بھائی فرمان کے بیٹے تابشیر کو دیکھ لیا کیجیے
جب بھی میری یاد آئے وہ بالکل میری کاربن کاپی ہے
بلکہ وجاہت میں مجھ سے بھی آگے نکل گیا ہے۔“

”آئے ہائے اللہ نہ کرے جوان کی پرچھائیں بھی
تابشیر پر پڑے۔“ چچی نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگا کر ہول
کر کہا تو وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ آئی۔

”ارے..... سنو! ہاں استوری! بات سنو.....“
وہ ابھی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی کہ تابشیر کے زور زور
سے چیخنے پر بمشکل اٹھ کر بیٹھی۔

”فائدہ چائے بنا کر لے آؤ اور ساتھ کچھ کھانے کو بھی۔“
”سارے دن سے تھک کر ابھی لیٹی ہوں اب کوئی کام
نہیں کروں گی۔“ اس نے غصے سے کہہ کر کمر کھینچتے ہوئے
دوبار لیٹنا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے کمر نیچے پھینک
کر اس مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ کر بیڈ سے کھڑا کر دیا گویا
وہ کوئی بے جان گڑیا ہو..... امی جان کی نیت بندھی ہوئی تھی
تابشیر نے اس موقع سے مکمل فائدہ اٹھایا۔

”دس منٹ میں سب تیار کر کے لاؤ۔“ اس نے اس کو
کچن میں لا کر ہی چھوڑا تھا۔

”میں ملازمہ نہیں ہوں تمہاری جو وقت بے وقت
تمہارے احکامات کی تکمیل میں جٹی رہوں گی۔“ اس قدر
سردی میں میٹھی نیند و گرم بستر چھوڑنے پر اس کا غصے سے
برا حال تھا۔

”ملازمہ نہیں نوکرانی تو ہو آ خر تمہارا پورا خرچہ

”سسرالی ہمیشہ لوہے کے پتے ثابت ہوتی ہے جن کو تکلیف و افیت کے باوجود چبانا پڑتا ہے۔“

”اپنے حسن اخلاق اور انتھک محنت سے ہی سب کو گرویدہ بنایا جاسکتا ہے۔ بی بی! کچھ کام زیادہ کر لینے سے اور دو باتیں کسی کی برواشت کر لینے سے تمہاری ہی عزت بنے گی آج نہیں تو کل دو خود تمہاری خوش مزاجی و اپنائیت کے معترف ہو جائیں گے۔“ دادی جان کے لہجے میں نرمی کے ساتھ ٹھوس اور بے لچک انداز تھا۔

”مجھے ان کا دکھ نہیں ہے دادی جان! مگر کاشف کی بے اعتنائی و بزدلی نے میری عزت نفس اور وقار کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ اعتماد اور مان کو چل ڈالا ہے۔ وہ کس طرح ان کی باتوں میں آ کر مجھے چھوڑ گئے اور ساتھ شرط بھی رکھ گئے گھر واپسی کی۔ کیا وہ مجھے رات دن گھر کے کاموں میں مصروف نہیں دیکھتے تھے؟ کیا وہ ماں بہنوں کے مزاج سے واقف نہیں تھے؟“ ساس مندوں سے زیادہ وہ کاشف کی بے مروتی سے ٹوٹی تھی۔

”ابھی بات ہے۔ کاشف گھر کا بڑا بیٹا ہے۔ اس پر ذمے داریاں بھی زیادہ ہیں۔ سعادت مند اور نیک اولاد تو خوش نصیبوں کو ملتی ہے۔ ہمیں ایک دن پرانی ہو جائیں گی ماں کی حکمرانی کب تک چل سکتی ہے۔ ایک دن سب جھگڑا تمہارا ہی ہوگا آخر کیوں بے صبری بن کر خود بھی گناہ کی مرتکب ہو رہی ہو اور میاں کو بھی گناہ گار کرنا چاہتی ہو.....“

”نہیں..... یہ کیا کہہ رہی ہیں دادی جان؟“ لڑکیاں حیرت سے بول اٹھیں۔

”دیکھو نا! اگر کاشف اس کی حمایت میں ماں بہنوں سے لڑتا تو گناہ گار نہیں ہوتا جب کہ ماں کے ساتھ بلند آواز میں بات کرنا بھی منع ہے۔“

”بہو کے ساتھ زیادتیاں کرنا حق تلفی اور لڑائی جھگڑا کرنا چھوٹی مندوں کا زبان چلانا بد تمیزی کرنا یہ سب تو حدیث میں آیا ہے.....“ وہ جل کر بولی۔

”لاحول والا قوۃ“ تو بے کر لڑکی کیوں بدعت کا شکار ہوتی ہے۔ بات تو ہمارے مذہب کا حصہ ہی نہیں

وہ ان کی قہر آلود نگاہوں اور چیرہ دستیوں کا شکار تھی۔

آج صبح تو اس کی ضبط کی انتہا ہو گئی جب چھوٹی مند نے معمولی سی بات پر اس سے نہایت بد تمیزی سے زبان درازی کی اور اس دوران ساس صاحبہ (جو ہر سمت یہ ڈھنڈورا پیٹتی پھرتی ہیں کہ ان کی بیٹیاں معصوم و بے زبان ہیں) خاموشی سے بیٹی کی زبان کے جوہر ملاحظہ کرتی رہیں۔ مجال ہے جو ذرا اسے سرزنش کی ہو بڑی بھاوج سے زبان چلانے پر۔ جب اس نے اپنے بارے میں صفائی دینے کی کوشش کی تو ساس اور دوسری مندوں نے مل کر وہ واویلا مچایا کہ سوتا ہوا کاشف گھبرا کر کمرے سے باہر آیا تو بڑا امنگ منظر تھا۔ ماں اور ساری بہنیں آنسو بہا رہی تھیں اور سویرا کھڑی ہکا بکا سی ان کی شان دار اداکاری دیکھ رہی تھی کہ ابھی زبانوں سے اس کے پرچے اڑانے والی بیٹے کو دیکھتے ہی کس طرح آنسو بہانے لگیں۔ پھر نہ نہ کرتے کرتے بھی چھوٹی بیٹی کی مظلومیت بے زبانی بھاوج سے بے انتہا پیار کا اظہار اور سویرا کی ہڈ حرامی منہ زوری اور زبان درازی کی فہرست پیش کر دی۔

جواباً کاشف صاحبہ اسی وقت اسے گیٹ کے باہر یہ کہہ کر چھوڑ گئے کہ ”جس لڑکی کے دل میں اس کی ماں بہنوں کے لیے جگہ نہیں اس لڑکی کے لیے اس کے گھر میں جگہ نہیں ہے اگر واپس آنا ہے تو اس کی ماں بہنوں سے معافی مانگے اور آئندہ ایسی گستاخیاں کبھی خواب میں بھی نہ کرے..... ورنہ کبھی واپس آنے کے خواب بھی نہ دیکھے۔“ وہ بہت سنگدلی سے کہہ کر چلا گیا۔ صبح سے اب تک رورو کر اس کا برا حال تھا۔

اور ستم یہ تھا کہ دادی جان اس کی ایک بات ماننے کو تیار نہیں تھیں۔

”دادی جان! یہ زیادتی ہے۔ ساس صاحبہ بیٹی کی بد تمیزی کے باوجود اس کی حمایت میں بیٹے سے مجھے گھر سے نکلوا سکتی ہیں اور آپ کہہ رہی ہیں کہ میں خود ہی چلی جاؤں اور ان سے اس خطا کی معافی مانگوں جو مجھ سے سرزد ہی نہیں ہوئی۔“ سویرا سخت برگشتہ تھی۔

انکشاف نے اس کے اندر توہین و تذلیل کی آگ بھڑکا دی تھی۔ غصے ورنج سے اس کا چہرہ سرخ انگارہ بن گیا تھا۔ بہت ضبط کے ساتھ اس نے بچوں کو روانہ کیا اور اندر کی سمت بڑھنے ہی والا تھا کہ خولہ وہاں آ گئی۔

”اوہ..... بچے کہاں گئے؟“ اس نے حیرانی سے دریافت کیا۔

”جہاں سے آئے تھے.....“ لہجے کی غراہٹ اور آنکھوں کی سرخی پر لہجے بھر کو اس کا دل کانپا تھا۔ ”مگر فکر تھی کہ نہ معلوم اس نے بچوں سے کیا کہہ کر بھیجا ہے اس لیے حوصلہ بلند کر کے پوچھا۔

”کیوں؟“ ابھی تو انھیں ہوم ورک کرنا تھا۔

”تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ تم میرے گھر کو یوشن ہوم بناؤ اور میری تذلیل کرو میری عزت و وقار کی دھجیاں بکھیرو ہر جگہ.....“ وہ قہر و غضب کی تصویر بنا کھڑا تھا۔

”بچوں کو تعلیم دینا عزت و وقار کے مینافی کب سے ہو گیا؟“ اس کے دھیسے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔

”تمہارے اس بھوسے بھرے دماغ میں سوچتے سمجھنے کے صلاحیت ہوتی تو کیا بات تھی! اوہ نہ نہ معلوم کس جرم کی سزا کے طور پر ہم پر مسلط کی گئی ہو..... کیا کہیں گے لوگ کہ ایک لڑکی کا بوجھ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ لڑکی بچوں کو یوشن دے کر اپنا خرچہ چلا رہی ہے۔ کیا یہی اوقات ہے ہماری؟“ اس کا غصہ جنون کی حدوں کی چھو چکا تھا۔ اس کی اونچی آواز اندر پہنچ چکی تھی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ گھر میں دادی جان اور چھوٹی امی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا جو اس کی اونچی آواز سن کر صحن میں آ گئی تھیں۔

”کیا ہوا؟ کیوں آتے ہی بچی کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ کیوں ناراض ہو رہے ہو؟“

”دادی جان! آپ لوگوں نے بچی بچی کہہ کر اس کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ کس نے اجازت دی ہے اسے کہ یہ ہمارے گھر میں بیٹھ کر ہماری حمیت کا جنازہ نکالے؟“

”یہ تم نے کیا ہمارا گھر ہمارا گھر لگا رکھا ہے؟ یہ گھر جتنا تمہارا ہے جتنا دوسروں کا ہے اتنا ہی حق اس کا بھی اس گھر

ہے۔ یہ ساری بات ہوتی ہے خاندانی وقار اور گھریلو تربیت اور اس بات کا احساس تمہاری ساس کو اس وقت ہو جائے گا جب ان کی بیٹیاں سسرال میں جا کر اپنے زبان کے کانٹوں سے دوسروں کو لہو لہان کریں گی تو کہاں انھیں پناہ ملے گی اور اس وقت صرف پچھتاوے ہی انھیں ہر سمت سے گھیرے کھڑے ہوں گے۔“

”ایسے بے حس و بے ضمیر لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ جب بھی وہ چاہیں گی کوئی کہانی بنا کر اپنی بیٹیوں کو مظلوم اور دوسروں کو ظالم ثابت کر دیں گی بس..... میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں اس گھر میں جب تک نہیں جاؤں گی تب تک کاشف الگ گھر نہیں لے لیتے۔“

”خاموش رہو..... ہماری زندگی میں تمہیں فیصلے کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے۔ تمہیں گھر جانا ہے یہ ہمارا حکم ہے۔ خوشی خوشی جاؤ گی تو اس گھر کے دروازے تم پر واہوں گے مگر لڑ جھگڑ کر آنے والی بیٹی کے لیے یہ دروازے بند رہیں گے۔“

دادی جان اپنا حکم سنا کر چلی گئیں۔ کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی صرف سویرا کے رونے کی آواز ماحول کو بو جھل اور اداس کر رہی تھی۔

”ہمارے گھر کے بزرگ ابھی بھی سو سال پہلے کی ذہنیت رکھتے ہیں۔ وفا شعاری و خدمت گزاری۔ سب کچھ سن کر بھی لبوں پر تالے ڈالے رکھنا۔“

☆☆☆

آج آفس سے وہ جلد ہی لوٹ آیا تھا۔ اپنے پورشن میں قدم رکھتے ہی پلاسٹک میٹ پر براجمان ڈھیروں بچوں کو اسکول ورک کرتے دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ بچوں نے بھی پڑھائی سے دھیان ہٹا کر چند لمحے اس کی جانب دیکھا پھر دوبارہ مصروف ہو گئے۔

”ہیلو بیٹا! آپ یہاں کس سے یوشن لینے آئے ہو؟“ اس نے ٹکٹوں کے بل بیٹھ کر پانچ سالہ بچی سے استفسار کیا۔

”کھولہ مس سے۔“ بچی نے شرما کر جواب دیا۔ اس

ای نے کوئی جواب نہیں دیا خاموشی سے فلاسک سے چائے گلوں میں نکالنے لگیں۔

”ایک بالکل معمولی سی بات کو تم نے اپنی انا اور عزت نفس کا مسئلہ بنا لیا ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جانتے ہونا اس لڑکی کی ٹریجڈی کتنی حساس اور دکھی ہے وہ..... اور کیوں نہ ہو باپ کے ہوتے ہوئے بھی بن باپ کی ہی لگتی ہے۔ یہ تو تمہاری ماں کو اللہ اجردے گا جس نے اس بد نصیب کو اپنے ممتا کے دامن میں پناہ دے کر ثابت کر دیا کہ انسان اپنے نفس کی راہ پر نہ چلے تو فرشتہ بن جاتا ہے۔ سگی ماں سے بڑھ کر خولہ کو محبت دی ہے تمہاری ماں نے.....“ دادی جان نے پر شفقت لہجے میں سمجھاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ روشن پیشانی دیانت سے دکتی براؤن آنکھیں اور کھڑی ناک کے نیچے گھنی سیاہ مونچھوں نے اس کی خوب صورتی کو بھرپور وجاہت بخشی تھی۔ وہائٹ کاشن کے کلف شدہ سوٹ میں اس کی شخصیت اس قدر نمایاں تھی کہ ان کے ذہن میں رضوان کا سراپا اتر آیا۔ وہ بھی تو ایسا ہی تھا خوب روڈ جیہدا سمارٹ لیکن کردار و عادات.....

ان کے اندر درد کی لہر دور تک پھیل گئی۔
ان کی کیفیت سے بے خبر تباشر کہہ رہا تھا۔
”یہی باتیں کر کر کے آپ لوگوں نے ان محترمہ کو احساس کمتری میں مبتلا کر ڈالا ہے۔ اس کے ایک دکھ کا سب کو احساس ہے سب اسے اتنا پیار و اپنائیت دیتے ہیں کہ اتنا سکھ لو اس کو اس کے والدین بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اس کی ہر بات ہر خواہش ہر ضرورت بن کہے پوری کی جاتی ہے تو پھر کس ضرورت کے تحت اس نے یہ سب کیا؟“

”عزت نفس اور وقار کی خاطر..... کسی سائل کے کشکول میں بھی بھیک ڈالی جاتی ہے تو اسے لمحے لمحے یہ احساس دلا کر ذلیل نہیں کیا جاتا کہ ہم تمہیں بھیک دے کر احسان کر رہے ہیں تم ہمارے ٹکڑوں پر زندہ ہو۔ تمہاری ضرورتیں ہم سے پوری ہو رہی ہیں۔ تم ہماری عنایتوں کے محتاج ہو۔“

پر ہے۔ یہ بات خوب ذہین نشین کر لو اور کیا معیوب بات کر دی میری بچی نے جو تم یوں آپے سے باہر ہو رہے ہو۔“ چھوٹی امی اپنی موجودگی میں اسے ایک گرم نگاہ سے نہ دیکھنے دیتی تھیں۔ اس وقت دھیرے دھیرے کانٹا وجود بے مائیگی و طعنہ زنی سے سپید پڑتا چہرہ اور بھگی بھگی آنکھوں سے جھلکتا خون ان کو ترپا گیا۔ آن واحد میں خولہ کو سینے سے لگا کر وہ اس سے سخت وترش لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

”اس کے آگے آپ نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ کس چیز کی کمی ہے۔ اسے کیا چاہیے۔ اسے؟ کون سے دلدردور کرنے کے لیے اس نے ٹیوشن دینی شروع کی؟ اسے روپوں کی ضرورت تھی آپ سے کہتی مجھ سے کہتی کیوں ہمارا تماشا بنانے کی کوشش کی؟ آج ٹیوشن ہوم سے ابتدا ہوئی ہے کل کشکول لے کر نکل پڑیں گی محترمہ! ہماری عزت کو مزید چار چاند لگانے کے لیے اور آپ اسے ”بچی کا بچپنا“ ہی سمجھتی رہیں گی۔“ وہ دھپ دھپ کرتا ہوا اپنے روم میں گھس کر باتھ روم میں چلا گیا۔

ایک گھنٹے بعد نیم گرم شاور لے کر کمرے میں آیا تو دادی جان اور چھوٹی امی کو چائے سینڈویچ کے ہمراہ اپنا منتظر پایا تو چند لمحے کے لیے نادم ہو کر رہ گیا کہ غصے میں وہ خود پر بالکل بھی قابو نہ پاسکتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا لیکن اس بار خولہ کی غیر ذمے دارانہ حرکت نے اسے ذہنی صدمہ پہنچایا تھا۔

”غسل نے یقیناً تمہارا غصہ ٹھنڈا کر دیا ہوگا اور عقل و فہم کو لوٹا دیا ہوگا آ کر چائے پیو ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ امی نے ناراض لہجے میں پلیٹ میں چپس کچپ اور سینڈویچ رکھ کر پہلے ساس کو دی۔ دوسری پلیٹ اس کے لیے فیمل برر رکھ کر کہا۔

”مجھے معلوم تھا آپ کو اس چھپکلی کی ہی طرف داری کرنی ہے بھلے نا جائز ہی ہو۔“ وہ مسکراتا ہوا دادی جان کے بربر میں بیٹھ کر فیمل سے پلیٹ اٹھا کر شوخی سے بولا۔

جنہیں وہ بہت احتیاط سے بریس کر کے شلیف میں لگاتی اور بہت نفاست سے پڑھتی تھی۔

تائبہ بڑے تایا کی بیٹی بہت ہنرمند و سلیقہ مند تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اس نے اور نمرہ نے کئی کورس کئے تھے۔ آج کل وہ دادی کی ہدایت پر چاروں کی جہیز کی بیڈشیز تیار کر رہی تھیں۔ جن میں کچھ پر چار سونی کا ورک تھا، پینٹنگ ورک اور کڑھائی کے کئی نمونے بھی شامل تھے۔ فراغت کے وقت دادی جان انھیں اپنی ہنرمندی بھی سکھاتی رہتی تھیں جو اس دور میں ناپید ہو چکی تھی۔ یہ ان کی محبت ہی تھی جو وہ نایاب ہنر سکھا رہی تھیں۔

ازحد حساسیت کے باعث بچپن سے ہی اس کی شخصیت میں ادھورا پن رہ گیا تھا۔ ان کی بہترین نگہداشت سے خاصی خامیاں اس کی ذات سے ہٹ چکی تھیں۔ مگر چند خامیاں ہزار ہا کوشش کے باوجود مٹ نہ سکی تھیں۔ جنہوں نے اس کی شخصیت کو ادھورا کر ڈالا تھا۔

وہ جس طرف بڑے شوق و ذوق سے پڑھتی تھی اتنی جلدی اس سے اکتا کر اسے چھوڑ دیا کرتی تھی۔ بیزاری اور جھنجلاہٹ کا شکار تو وہ رہتی ہی تھی۔

ایم اے ادھورا چھوڑ کر پچھلے سال سے گھر بیٹھ گئی تھی۔ تائبہ اور نمرہ کے ساتھ کورسز اس نے بھی شروع کیے مگر اپنی مقلون مزاجی کے باعث مکمل ہونے سے چند ہفتے پہلے چھوڑ کر بیٹھ گئی۔ چھوٹی امی کی ذمے داری نبھانے کے علاوہ اور کوئی کام وہ مکمل نہیں کرتی تھی۔

اپنی ذات کی تو اسے فکر ہی نہیں تھی۔ فارغ وقت میں اوپر سیڑھیوں پر بیٹھ کر پہروں سوچنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ دادی جان کو شام ڈھلے اس کا سیڑھیوں پر تنہا بیٹھنا پسند نہیں تھا۔ صحن میں لگے امروڈ جامن اور نیم کے درختوں کا سایہ پوری چھت اور سیڑھیوں پر رہتا تھا۔ ان کا خیال تھا، کنواری لڑکیوں کو درختوں کے نیچے اس وقت نہیں بیٹھنا چاہیے مگر وہ عادت کے باعث ضرور بیٹھتی تھی کہ عجیب سکون میسر آتا تھا۔

شب برأت ان سب نے بہت عبادت میں

”امی..... امی! اتنی ناراضگی! اتنی خفگی!“ اس نے چائے کا گک اٹھاتے ہوئے حیرانی سے کہا۔ ”میں اسے اس گھر کا فرد سمجھتا ہوں، محتاج، حقیر، ضرورت مند نہیں۔“

”نہیں..... تم اس کو صرف ملازمہ سمجھتے ہو ملازمہ اور کچھ نہیں.....“ وہ کبیدگی سے بولیں۔ ”اس لیے کہ آج جس قسم کا برتاؤ تم نے اس کے ساتھ کیا ہے اس حرکت سے ثابت ہو گیا ہے کہ یہ صرف تمہارا گھر ہے۔ تمہارا اور کسی کی جرأت نہیں ہے اپنی مرضی سے یہاں کچھ کرنے کی.....“

”بھو! چھوڑا اب جو ہونا تھا ہو چکا کیوں دل کو لگاتی ہو۔“

”نہیں اماں جان! وہ مجھے جان سے پیاری ہے۔ قسم سے اس نے مجھے اتنی راحت و آرام دے رکھا ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ اتنا کرم کرے گا مجھ پر اس کی شکل میں۔ اس کی دل شکنی میری دل شکنی ہے اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو میرا لہو ہیں۔“ وہ بھرائے لہجے میں بولیں تو تباشر کو اپنی جلد بازی پر غلطی کا احساس ہوا۔

”سوری امی! پلیز معاف کر دیں آپ اسے چاہتی ہیں اس کا احساس مجھے بچپن سے ہے مگر ایسی گہری محبت کا احساس ہوا۔ مجھے آج پہلی بار ہوا ہے۔“ وہ صوفے سے اٹھ کر کارپٹ پر بیٹھ کر ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر ندامت سے بولا تو وہ بھگی آنکھوں سے مسکرا دیں۔

☆☆☆

دن تیزی سے گزر رہے تھے شعبان کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ ان سب نے مل کر گوشے گوشے کی صفائی کرنا شروع کر دی تھی۔ اور گھر ایک دم سے نکھر آیا تھا۔

نوریا کے ہاتھ میں اس ماہ کا شمارہ تھا اور تمام اسٹوریز اس کی من پسند رائٹرز کی تھیں۔ سو وہ صبح ہی سے کمرے میں بند ڈائجسٹ پڑھنے میں مگن تھی۔ گھر میں وہ واحد لڑکی تھی جسے ادب سے اس قدر محبت تھی۔ رسائل اور ماہنامہ شماروں سے اسے عشق تھا۔ راستوں بازاروں میں اسے کوئی ڈائجسٹ والا اشال نظر آ جاتا تو وہ سیدھی وہیں پہنچ جاتی اور نئی پرانی ڈائجسٹیں اس کے بیگ میں ہوتیں۔

گزارا دی۔ سارا دن حلوے بنانے اور بانٹنے میں گزارا تھا اور دوسرے دن کا روزہ بھی سب نے رکھا تھا افطار پر خوب زبردست اہتمام کیا گیا تھا۔ رمضان المبارک کی آمد میں دو ہفتے باقی تھے۔ انہوں نے اس کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ ویسے تو ماہانہ خریداری کچن کے سامان کی ہر ماہ ہوتی تھی۔ مگر رمضان کے لیے خصوصی تیاری ہوتی تھی۔ تائی اور چچی مل کر بازار گئی ہوتی تھیں نیا ڈزریٹ اور مصالحے کے ڈبے وغیرہ لینے وہ سب دادی جان کے ہمراہ مختلف قسم کی چٹنیاں کچپ اور فروٹ چاٹ مصالحہ بنانے میں لگی ہوئی تھیں۔ محسن میں افراتفری مچی ہوئی تھی پلنگ پر دادی جان کے ساتھ چھوٹی امی بیٹھی مٹر کے دانے نکال رہی تھیں دادی جان کی ڈائریکشن عروج پر تھی۔

خولہ نے کچپ کے لیے سرخ سرخ بڑے بڑے ٹماٹر دھو کر دیکھی میں پوائل کرنے رکھے تھے اور دوسرا سامان تیار کرنے بیٹھ گئی تھی تاہم لو بخارے دھو کر خشک کر رہی تھی نمبرہ امی سے بیج صاف کر رہی تھی ہادیہ کالج کی بوتلیں دھو کر دھوپ میں رکھ رہی تھی جن میں کچپ اور چٹنیاں محفوظ کی جانی تھیں۔ نویرا ابھی کالج سے نہیں لوٹی تھی۔ کال نیل مسلسل زیر عتاب تھی وہ ایک دوسرے کو اشارے کر رہی تھیں کہ گیٹ کھولنے جائے مگر کوئی گیٹ کھولنے کو تیار نہیں تھا۔ دادی کی ڈانٹ کھا کر ہادیہ گیٹ کھولنے لگی تھی۔

”اگر تم نے فوراً نیل سے ہاتھ نہیں ہٹایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ گیٹ کھولتے ہی اس نے طیش زدہ انداز میں کہا تھا۔ اس شخص نے فوراً ہی گھبرا کر نیل سے انگلی ہٹائی تھی۔

”مجھے خضر فیروز کہتے ہیں۔ ملتان سے آیا ہوں۔“ اس کے جارحانہ تیور دیکھ کر وہ خاصا معقول سا بندہ ہونق نظر آ رہا تھا۔ ہاتھ میں اس نے سفری بیگ پکڑ رکھا تھا۔ ”والپس کا کرایہ نہیں ہے جیب کٹ گئی ہوگی مالی مدد کی ضرورت ہوگی۔۔۔۔۔ جاؤ جاؤ بابا! معاف کر دو تم جیسے

ہٹے کتے نو جوانوں کا یہ ڈھونگ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں چلو جاؤ یہاں سے ایک روپیہ نہیں ملنے والا نہیں یہاں پر۔۔۔۔۔“

”نہ۔۔۔۔۔ نہ نہیں آپ غلط سمجھ رہی ہیں روپے تو بہت ہیں میرے پاس۔۔۔۔۔“ اس نے بوکھلا کر جیکٹ کی جیب سے پھولا ہوا والٹ نکال کر دکھایا جو بڑے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ”میں آئی سے نہ بہت سے ملنے آیا ہوں۔۔۔۔۔“

”ہاں تو پہلے بولتے تھے میں بھی آج کل کے ماڈرن فقیر ہیں۔۔۔۔۔ وہ اسے ساتھ لے کر ڈرائیگ روم میں چلی آئی اور اسے وہاں بٹھا کر دادی جان کو اطلاع دی تھی۔

”ارے خضر آیا ہے! آپاشاہ جہاں کا نواسہ یہاں لے کر آؤنا اسے کوئی غیر تھوڑی ہے وہ جو اسے مہمان خانے میں بٹھا کر آ گئی ہو۔۔۔۔۔ دادی جان پر جوش لہجے میں بولیں۔

”ارے دادی جان! ضروری تھوڑی ہے آپ ہر آنے جانے والوں کو اپنی پوتیوں کے سکھڑا لے اور سلیقہ مندی کے ہنر دکھائیں اس وقت محسن کی حالت کسی شریف آدس کو بٹھانے کے قابل نہیں ہے۔“

خولہ کے کہنے پر وہ اٹھ کھنکھیں اور چائے کے ساتھ لوازمات بھیجنے کا حکم دے کر چلی گئیں۔ تاہم چائے تیار کرنے لگی نمبرہ نے فریج سے کباب نکال کر فرانی کے اور ہادیہ کہ یہی نیک و وضع دار گھرانوں کی بیٹیوں کے چلن ہوتے ہیں۔ لیکن اب وقت بدل گیا ہے نیک چلن بد لچاکی کا پیرا ہن اوڑھ چکے ہیں۔“ یسرہ نے اپنی بیٹی کے منہ میں فیڈر دیتے ہوئے کلس کر کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا جب وقت بدل گیا ہے تو لوگوں کے مزاج و عادات کیوں نہیں بدلے۔ پہلے یہ بات ذہن نشین کر لو کہ نہ ساری سائیں قصائی ہوتی ہیں اور نہ ہی تمام نندیں جھگڑاؤ کسی گھر میں بہو بد تمیز و بد مزاج ہوتی ہے تو ساس نندیں اس پر جان چھڑکنے والی ہوتی ہیں اور کوئی بہو اخلاق و مروت اور ایثار و محبت کے خزانے لے کر آتی ہے تو ساس و نندوں کا رویہ ایسا ہی ہوتا

”پلیز شاپنگ نہیں فیضی۔“

”تم اس معاملے میں نہیں بولا کرو۔“ اس کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود فیضان نے خوب زبردست شاپنگ کروائی تھی۔ جب وہ پیکٹس سے لدی پھندی گھر میں داخل ہوئی تو تاثیر سے سب سے پہلے سامنا ہوا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں پکڑے شاپرز کو اس نے خاصی سرد مہری و ناپسندیدگی سے دیکھا تھا اور اس پر قہر آلود نگاہ ڈال کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا جبکہ چھوٹی امی اس سے بہت مسرت سے ملی تھیں۔ فیضان اسے چھوڑ کر فوراً ہی چلا گیا تھا۔

”تاثیر کو بھیجا تھا میں نے دوپہر کو تمہیں لینے خالہ نے بتایا کہ تم فیضی کے ساتھ گھر جا چکی ہو میں سمجھ گئی کہ لے گیا ہو گا کہیں سیر کرانے بہت خیال رکھنے والا بچہ ہے۔“

”ہاں..... دیکھیں نا..... زبردستی منع کرتے کرتے بھی اتنی شاپنگ کروادی۔“

”ہاں..... اپنے گھر والوں سے بالکل مختلف مزاج کا لڑکا ہے۔“

”تاثیر آج آفس نہیں گئے؟“ اس کی نگاہوں سے خوف آ رہا تھا۔

”جلدی آ گیا تھا۔ اماں جان تائی اور چچی بہت پوچھ رہی تھیں تمہیں۔ ان کو سلام کر کے آ جاؤ۔“

☆☆☆

پر سکون بہتے سمندر میں گویا ایک دم ہی بھونچال آیا تھا۔ اور ہر طرف افراتفری سی پھیل گئی تھی۔ بائیس سال بعد رضوان حسین کو اپنے وطن اپنے لوگوں کی یاد آئی تھی اور وہ بیوی بیٹی سمیت رمضان سے قبل پاکستان آ رہے تھے۔ گھر میں ان کے آنے کی خوشی سب گویا تھی۔ دادی جان اپنی تمام بیماری بھول کر بیٹے بہو کے لیے تیاریاں کروا رہی تھیں۔

دادا جان کے وقتوں کے بنے ہوئے اس دو منزلہ گھر

ہے جس کا سویرا شکار ہے۔ عموماً ایسا انہی گھرانوں میں ہوتا ہے جہاں لوگ دین و دنیا کی تعلیم سے نابلد ہوتے ہیں یہ وہ معصوم لوگ ہوتے ہیں جو نفس کے شر کا شکار ہو کر معاشرے میں اپنا مقام خراب کر ڈالتے ہیں اور آخرت میں عذاب کے مستحق ہوتے ہیں۔ حقوق العباد سے بے بہرہ ہو کر۔ مجھے سخت غصہ بھی آتا ہے ایسے لوگوں پر اور ترس بھی۔“

☆☆☆

کوئی بات کرو کیوں اس قدر خاموش ہو؟“ فیضان نے کافی پیٹے ہوئے اس کی جانب بغور دیکھا سرخ و سیاہ کائین کے تھری پیس سوٹ میں اس کی شفاف رنگت دمک رہی تھی۔

سرد موسم کے باعث رنگت میں کچھ سرخی آگئی تھی جو اسے از حد پرکشش بنا رہی تھی۔ اس کی سادگی میں حسن تھا سحر انگیزی تھی ایک باردیکھنے والا بار بار دیکھنے کا تمنائی بن جاتا تھا۔

مگر وہ اپنے حسن سے بالکل بے پروا رہا کرتی تھی۔ اسے اپنی ذات سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

”کیا بات کروں؟“ اس نے سینڈوچ کھاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”اپنا آفس چھوڑ کر تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں تاکہ تم انجوائے کرو خوش ہو مگر تم.....“

”مجھے نانی جان کے پاس ہی رہنے دیتے ان کی قربت میں بہت سکون ملتا ہے مجھے۔“

”اپنی بے سکونی کا بہت احساس ہے تمہیں؟ کبھی میرے بارے میں سوچا ہے.....“

”نہیں..... تمہارے بارے میں سوچنے کے لیے بہت سارے لوگ موجود ہیں۔“

”لیکن تم تو نہیں ہونا ان میں.....“ وہ شوخی سے گویا ہوا۔

”قاتل تو بات نہیں کرو جلدی کرو کل سے گھر سے آئی ہوئی ہوں چھوٹی امی بہت یاد آ رہی ہیں۔“

”کافی تو ختم کرو شاپنگ کروا کر گھر چھوڑ کر آؤں گا۔“

میں اب بھی خاصی گنجائش تھی۔ اوپر کی منزل میں جہاں تایا جان کی قیمتی آباد تھی وہیں ایک خالی پورشن ان کے لیے سیٹ ہو چکا تھا۔ کل کی فلائٹ سے انھیں آنا تھا۔ تایا جان اور چچا جان کے ہمراہ تینوں لڑکے بھی انھیں ریسیو کرنے کا ارادہ رکھتے تھے نمبر ہادیہ بھی ایئر پورٹ دیکھنے کے اور نئی کزن سے ملنے کے شوق میں ایئر پورٹ جانے کو تیار تھیں۔

”تم بھی تیار ہو جاؤ بیٹی! سب جا رہے ہیں۔“ چھوٹی امی نے اسے خاموش بیٹھے دیکھ کر کہا۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا جانے کو چھوٹی امی!.....“

”کیوں؟ وہ تمہارے ماں باپ ہیں، بہن ہے ان سے ملنے کا شوق نہیں ہے۔“

”بائیس سالوں کے کسی ایک لمحے میں بھی مجھے ان رشتوں کا احساس دیا جاتا تو میرے اندریوں بے بسی ولا تعلقی کی برف آج نہ جمی ہوتی۔ اتنے اہم دن میرے اندر سنائے تو نہ اترتے۔“

”میری بیٹی! ٹھیک ہو جائے گا اب سب کچھ فکر مت کرو.....“ انہوں نے اسے سینے سے لگا کر تسلی دی۔

کیونکہ وہ اس کی کیفیت بخوبی سمجھ رہی تھیں۔

☆☆☆

گھر میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ رضوان صاحب اپنی بیوی اور بیٹی ماہ رخ کے ہمراہ وطن واپس آ چکے تھے۔ بیٹا واپس نہیں آیا تھا کہ اس نے ٹوکیو میں ہی شادی کر کے وہیں کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ طویل عرصے بعد گھر والوں کے درمیان اپنی موجودگی پر رضوان صاحب بہت مسرور تھے اور ان سے زیادہ ماہ رخ جسے سوئی کہہ کر پکارا جاتا تھا وہ از حد خوش تھی۔ وہ پہلی نظر میں ہی تباشر پر فریضہ ہو گئی تھی۔

سرمنی آنکھوں سرخ و سپید رنگت اور ڈارک براؤن بالوں والی سوئی کی خوب صورتی نے اس سڑیل مزاج شخص پر بھی خاطر خواہ اثر کیا تھا۔ اکثر و بیشتر وہ ساتھ ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ تباشر کے چہرے پر رنگ تھے۔ اس کی آنکھوں میں جلتی محبت کی قندیلیں کسی سے بھی

پوشیدہ نہ رہ سکی تھیں۔

رات بھی کھانے کے بعد حسب معمول وہ سوئی کو لے کر کافی پینے باہر گیا تو وہ خولہ کو گھیر کر بیٹھ گئیں۔ پہلے نویرا نے کہا۔

”تمہاری قریب کی نگاہ اتنی کمزور کیوں ہو گئی ہے؟“

”ارے..... نہیں تو“ میری نگاہیں تو درست کام کر رہی ہیں۔“ وہ حیران گی سے بولی۔

”ہاں..... تب ہی وہ پرکٹی کبوتری تباشر کو روز بروز قابو کر رہی ہے۔“

”روز دونوں جاتے ہیں باہر گھنٹوں کے حساب سے اسے لے جانے کے لیے تباشر کے پاس وقت ہی وقت ہے اور گھر کی لڑکی کے لیے اسے فراغت کا کوئی لمحہ میسر نہیں ہوتا۔ وہ سوئی کے اشاروں پر چلتا ہے۔“ تائبہ بھی از حد نالاں تھی۔

”تم لوگ کیوں اتنا فکر مند ہو رہی ہو؟..... اس کی مرضی ہے شروع سے ہی اپنی ذات کے حوالے سے کس قدر خود پسند رہا ہے۔ کسی کی مرضی کے مطابق چلنے والا بندہ نہیں ہے وہ اور نہ ہی اپنے معاملے میں کسی کی مداخلت برداشت کرتا ہے۔“

”اؤہ..... تم تو مقابلے سے قبل ہی شکست تسلیم کر رہی ہو بہادر! بخولہ ایسے کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص جو بچپن سے اب تک ہمارے درمیان رہا اور وہ لڑکی جو چند دنوں سے ہم میں موجود ہے اسے ہم سے چرا کر لے جائے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو نمبرہ میرا کسی سے کوئی مقابلہ نہیں ہو رہا اور تباشر کوئی سونے کی انگلی نہیں ہے جسے کوئی چرانے کی کوشش کرے گا.....“ وہ اطمینان سے دھلے ہوئے کپڑے تہ کر کے وارڈراب میں رکھتے ہوئے بولی۔

”وہ تم سے تباشر کو چھین رہی ہے بے وقوف۔ بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”وہ میرا تھا ہی کب؟ بچپن سے آج تک وہ مجھے غاصب، لٹیری اور چالاک سمجھتا آیا ہے۔ ایک ایسا ناقابل

بڑا مردہ سا ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا۔ مضطرب بے سکون ہے کل اور بے چین سا۔

”اے خولہ! دیکھ رہی ہو اس دور کے مجنوں ثانی کو کجبت اس منحوس لیلیٰ کے فراق کے چند گھنٹے کس قدر جاں گسل اور بے مزہ ہیں۔ آخر تم کب تک تماشہ دیکھتی رہو گی؟“ ہادیہ نے اوپر ٹیس پر ٹپکتے ہوئے تباشر کی جانب اشارہ کر کے غصے سے کہا۔

”بزرگ کہتے ہیں جس منزل پر پہنچنا نہیں اس کا راستہ کیوں ناپیں وہ مجنوں بن کر لیلیٰ کے فراق میں صحراؤں کی خاک چھانے یا فرہاد بن کر شیریں کے حصول کے لیے پہاڑ کے دامن سے دودھ نکالے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے اور نہ ہی تم مجھے اس حوالے سے ٹیز کرنے کی آئندہ کوشش کرنا۔ میں اس رشتے کو نہیں مانتی۔“ اس نے سختی سے کہہ کر آنکھیں موند لیں تو وہ کئی لمحے تک تاسف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی پھر چلی گئی۔

اس کے قدموں کی چاپ دور ہوئی تو اس نے آنکھیں کھول لیں۔ کمرے کی تنہائی و خاموشی اس کے اندر تک اترتی چلی گئی اور وہ کافی دیر تک ویران نگاہوں سے چھت کو گھورتی رہی۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ باہر خاموشی ہر سمت پھرے لگائے بیٹھی ہوتی ہے مگر اندر کی دنیا میں کہرام برپا ہوتا ہے جذبات و احساسات کی چیخ و پکار سے روح کے تار جھنجھٹا اٹھتے ہیں۔ اسی طوفان کی تمدنیز لہروں میں اس کی ذات لمحہ لمحہ ڈوب اور ابھر رہی تھی۔ اپنے بارے میں کسی بھی قسم کی خوش فہمی اسے کبھی نہ رہی تھی مگر تھوڑا بہت عزت نفس اور انا کا زعم نہ معلوم کس لمحے اس کے براجمان ہو گیا تھا جو اس کے سکے باپ نے پل بھر میں چکنا چور کر دیا تھا۔ ان کی آمد پر دادی جان نے بڑے والہانہ انداز میں اسے آگے کر کے بیٹے سے کہا تھا۔

”رضوان! اپنی بیٹی کو تو سینے سے لگاؤ پہلی بار مل رہے ہو بد نصیب سے۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے اماں!“ وہ بے نیازی سے کہہ

برداشت و قابل نفرت وجود جس نے گھر کی ہر شے کے علاوہ اس کی ماں کی چاہت و شفقت میں بھی حصہ بٹورا ہے۔

”تم یہی تو نہیں سمجھتی میری جان دراصل سچی محبت اور لازوال عشق تو ایسے ہی ہیرو کی باتوں میں چھپا ہوتا ہے بظاہر تو وہ.....“

”پلیز..... پلیز نوریا! تم کبھی اپنی اس افسانوی دنیا سے باہر بھی نکلا کرو حقیقت افسانوں سے بہت مختلف و تکلیف دہ ہوتی ہے۔“ اس کے لمحے میں سنجیدگی تھی۔

”اتنی مختلف بھی نہیں جتنی تم سمجھتی ہو اس دور میں افسانے حقیقتوں سے ہی کشید کیے جاتے ہیں۔ اور ممکن حد تک ہمیں گمانڈنیں بھی دی جانی ہے۔“

”چلو درست ہے جو تم کہہ رہی ہو مگر یہ بتاؤ میرے بچے کیوں بڑی ہو؟“

”تباشر کو سوئی کے چنگل سے نکالو کیونکہ وہ تمہارا نصیب ہے۔“

”واٹ؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ کپڑوں کی تہ اس کے ہاتھ سے پھسلتی گئی۔

”سچ کہہ رہی ہوں کل ہی چھوٹی امی دادی جان سے کہہ رہی تھیں کہ وہ تباشر کے سوئی کی طرف پڑھتے قدم روکیں کیونکہ تم سے ان کی منگنی بچپن میں ہو گئی تھی۔“

”نہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ بالکل بے جان انداز میں بیٹھی تھی۔

”مجھے بھی اتفاقاً کل ہی معلوم ہوا ہے۔ ہم سب بچپن سے ہی ”پرائی“ ہو چکی ہیں۔ تائبہ تبارک کے نام ہو چکی ہیں۔ نمرہ پر تائب صاحب مہر لگا چکے ہیں تم تباشر کی انگلی کا نگینہ ہو میں اور بے چاری نوریا رہ گئے ہیں تو ہمارے لیے بھی کوئی نہ کوئی دل والا آئے گا ہی جلد از جلد انشاء اللہ.....“ ہادیہ کھلکھلائی تھی۔

ان سب کی باتیں دوسرے دن ہی سچ ثابت ہوئی تھیں۔ رضوان صاحب کہیں ڈنر پر بیٹی اور بیوی کے ساتھ مدعو تھے۔ تباشر سوئی کی غیر موجودگی میں خاصا

اور بااوصاف لڑکی کا انتخاب کر لیا گیا ہے۔ سوئی جیسی لڑکیاں گھر خراب تو کر سکتی ہیں مگر بسانے کے ہنر سے نا آشنا ہوتی ہیں۔“

”دادی جان! پلیز آپ اس کی انسلٹ مت کریں وہ ایسی نہیں ہے۔“ وہ حزبز ہو کر بولا۔

”کسی اور کا نہیں ہے احساس تو میرا ہی خیال کر لو..... کیا وہ لڑکی خولہ جیسا آرام و محبت دے سکے گی مجھے؟ بے لوث خدمت کر سکے گی میری؟ پھر پرانے خون کی خاطر کیوں ہم اپنا خون رو کریں آخر کار اپنا اپنا ہی ہوتا ہے۔“ چھوٹی امی کی آواز آئی تھی۔

”وہ چچا جان کی سوتیلی ہی سہی مگر بیٹی تو ہے اور میں امی جان! خون کے رشتوں سے زیادہ دل کے رشتوں کو اولیت دیتا ہوں ایسے رشتوں کو اہمیت دیتا ہوں جنہیں پا کر بندہ سکون اور مسرت و طمانیت کے احساسات سے سرشار رہے۔ بھلا وہ لڑکی مجھے کہاں مکمل طمانیت و راحت سے لبریز حیات دے سکتی ہے جو خود ادھوری ہے۔ اس کی سوچ احساس خواہش ہر عمل میں ادھورا پن ہے جس کی ذات ادھوری ہو میں ایسی لڑکی کو اپنا کر اپنی زندگی کی خوشیوں سے قبل از وقت دستبردار نہیں ہو سکتا.....“ تباشیر کا لہجہ استہزائیہ اور توہین آمیز تھا۔ خولہ کو رگوں میں لاوا دوڑتا ہوا محسوس ہوا اور لمحے بھر میں وہ فیصلہ کر کے اندر کمرے میں اس کے مقابل کھڑی ہو کر بولی.....

”تباشیر صاحب! کسی خوش فہمی میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے تم کیا انکار کرو گے میں خود انکار کرتی ہوں کہ میں تم جیسے کم ظرف و بے حس آدمی سے رشتہ جوڑنے سے بہتر موت سے رشتہ وابستہ کرنا اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی ایک بار نہیں ہزار بار لعنت بھیجتی ہوں میں اس رشتے پر.....“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے از حد اطمینان سے کہا تھا۔

اس کی نگاہوں میں ایسی تپش اور لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ چند لمحے قبل فر فر بولنے والا تباشیر اس کے چہرے سے جھٹکنے والا جاہ و جلال دیکھتا رہ گیا۔

کر اس کے سر پر دھیرے سے ہاتھ رکھ کر آگے بڑھ گئے تھے جب کہ سوئی ماں نے بے تاثر انداز میں اس کے رخسار کو بوسہ دیا تھا اور سوئی نے مصافحہ کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ وہ ویسی ہی تھی جیسے امیر گھرانے کی خود سر و مغرور لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اسے اپنے حسن پر ناز تھا تو دولت پر از حد فخر گھر کی کسی لڑکی کو اس نے ذرا بھی لفٹ نہیں دی تھی بلکہ لڑکوں کو بھی کبھی موڈ ہوتا تو لفٹ دیتی ورنہ سارا دن اس کا کمرے میں گزرتا تھا۔ ماں کی از حد لاڈلی تھی۔

رضوان صاحب بھی اپنی ساری شفقت و محبت اس پر لٹاتے تھے۔ سگی بیٹی کو ایک نگاہ پیار سے دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ تباشیر کی وجہ پر سنائی پر وہ عاشق تھی آفس سے آتے ہی پھر سارا وقت اس کے لیے ہی ہوتا تھا اور رضوان صاحب خود اس سے کہہ کر لاڈلی بیٹی کو سیر کے لیے بھیجتے وہ اس لمحے ہی ٹوٹ گئی تھی جب باپ کی بھرپور بے اعتنائی اور بے حس کے مظاہرے نے اسے بالکل ہی بے مول و بے اور قعت کر ڈالا تھا۔ پھر آپ تو کسی بھی رشتے کی کئی چاہ نہ رہی تھی۔ تباشیر پر تو اسے کبھی اعتبار نہ رہا تھا اس کی سنگت میں گزارے لمحات اسے گھبراہٹ بوکھلاہٹ اور پشیمانی کا شکار کر دیا کرتے تھے کجا کہ ساری حیات کا ساتھ یہ ناممکن تھا۔

وہ سوچوں میں گم تھی کہ برابر کے کمرے سے تباشیر کی تیز آوازیں سن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”دادی جان! میں نہیں مانتا ان فرسودہ و جاہلانہ رشتوں کو آپ نے بچپن میں منگنی کر دی تھی تو مجھ سے پوچھ کر نہیں کی تھی۔ میری زندگی میں صرف ایک ہی لڑکی داخل ہو سکتی ہے اور وہ سوئی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی اگر وہ نہیں تو کوئی اور نہیں ہرگز نہیں۔“ اس کے دھیمے لہجے میں بھی ہٹ دھرمی اور ضدی پن نمایاں تھا۔

”ہوش کے ناخن لو بیٹا! تمہیں فیصلہ ماننے کا حکم دیا گیا ہے سنانے کا نہیں۔ تمہاری دلہن صرف ایک ہی لڑکی بنے گی اور وہ خولہ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی خاندان قائم رکھنے کے لیے اپنی نسل بڑھانے کے لیے خولہ جیسی صابر

چھوٹی امی اور دادی جان بھی حق دق سی اس کی جرأت دیکھ رہی تھیں۔

”چھوٹی امی! آپ کو میں نہیں چھوڑوں گی میری محبت خدمت و خیال صرف اپنی ماں کے لیے ہے۔ بیٹے تو ایک وقت پر بدل جایا کرتے ہیں مگر بیٹیاں تو یونہی ماؤں کی خدمت کیا کرتی ہیں۔ بے لوث بے غرض بغیر کسی لالچ کے.....“ وہ ان کی گود میں سر رکھ کر بولی تو وہ بے اختیار رونے لگیں۔ تباشر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

رضوان صاحب نے بزنس شروع کر دیا تھا اور اپنی فیملی کو لے کر علیحدہ کونٹھی میں شفٹ ہو گئے تھے۔ انہوں نے ماں کو ساتھ لانا چاہا تھا مگر ان کی بیگم نے اجازت نہیں دی تھی اور وہ ان کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی چلنے کے عادی نہیں تھے۔

ان کے جانے سے گھر میں سکون کی فضا چھا گئی تھی ورنہ وقت بے وقت کی ان کی فرمائش اور مہمانوں دوستوں کی آمد و رفت نے گھر کے بجٹ کے ساتھ ساتھ ان کی توانائیوں کو بھی کمزور کر ڈالا تھا۔

رمضان المبارک کا رحمتوں بھرا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ سب روز رکھنے کے عادی تھے۔ افطار کے وقت خوب رونق ہوتی تھی۔ سب کی فرمائشوں کو مد نظر رکھ کر اہتمام بھی بھرپور کیا جاتا تھا۔ افطار کا سامان لڑکیاں مل کر تیار کرتی تھیں جب کہ سحری تائی امی اور چچی جان پکایا کرتیں۔

”سنو کچھ کھانے کو لے آؤ..... سوئی کو بھوک لگی ہے.....“ وہ نماز ظہر کے بعد قرآن لے کر بیٹھی ہی تھی کہ تباشر نے آکر اس سے کہا۔

”اچھا.....“ وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ اس دن کے بعد سے ان دونوں کے درمیان گفتگو بالکل برائے نام رہ گئی تھی۔ وہ یاد سے اس کا ہر کام تیار کر کے پہلے ہی رکھ دیا کرتی تھی اور اس کی بھی کوئی شش ہوتی تھی کہ کسی طرح اس سے مخاطب نہ ہونا پڑے۔ کبھی از حد مجبوری کے عالم

میں ہی مخاطب ہوتا تھا وہ بھی نہایت مختصر انداز میں۔ فریق خاص ڈشوں سے بھرا ہوا تھا۔ خولہ نے اس کی پسند کے لحاظ سے فرائڈ فش، قیمہ مٹر اور ماش کی دال نکال کر گرم کر لی تھی ساتھ ہی پھلکے بنا کر سلاوا اور رائے تیار کر کے ٹرائی میں رکھ رہی تھی کہ ہادیہ اور نمرہ کچن میں داخل ہو کر حیرانی سے گویا ہوئیں۔

”خیریت! کون مہمان آ گیا جس کے لیے روزے میں اتنا خوار ہو رہی ہو؟“

”سوئی!“ اس نے برز بند کر کے صافی سے خشک آنا صاف کرتے ہوئے کہا۔

”سوئی نہیں! اس کا نام تو پوائزن ہونا چاہیے تھا۔ کس قدر بے ہودہ لڑکی ہے حیات تو چھو کر بھی نہیں گزری اسے۔ ہر روز منہ اٹھا کر آ جاتی ہے روزے میں تنگ کرنے کے لیے۔ بندہ خود روزے نہ رکھے مگر روزہ داروں کا تو احترام کر لے۔ مگر لگتا ہے احترام و احساس تو ان ماں بیٹی کو چھو کر گزرا ہی نہیں۔ آنٹی بھی کئی مرتبہ آچکی ہیں اور ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا ہے روزہ نہ رکھنے کا۔“

”تم نے ایک بات نوٹ کی ہم لوگوں کو انہوں نے صرف ایک بار کہا تھا کہ ان کی شاندار کونٹھی دیکھنے آئیں مگر اس کے بعد وہ دوسرے تیسرے دن خود ہی چلی آتی ہیں کہ کہیں ہم نہ وہاں پہنچ جائیں اور انھیں مہمان داری کرنا پڑ جائے.....“ ہادیہ خاصی تپتی ہوئی تھی۔

”کنجوس نمبروں ہیں۔ ہمیں گفٹ کیسے دیئے تھے استعمال شدہ پرفیومز کھسی پٹی میک اپ کس جوہم نے ایک بار بھی استعمال نہیں کی اور.....“

”بس..... بس خاموش رہو۔ کیوں اپنا روزہ مکروہ کر رہی ہو کم از کم روزے میں تو ان باتوں سے پرہیز کیا کرو۔ اس نے ٹرائی گھسیٹے ہوئے تنبیہی لہجے میں کہا۔

”غلط تھوڑی بول رہے ہیں اور اس بات کا خیال تو تباشر بھائی کو رکھنا چاہیے خود تو پورے روزے رکھتے ہیں اور اپنی اس کچھ لگتی کو روزے رکھنے کی فضیلت نہیں بتاتے۔“ وہ انھیں یوں ہی بک بک کرتا چھوڑ کر تباشر کے

کمرے میں چلی آئی۔

وہ کمپیوٹر پر مصروف تھا جب کہ سوئی مزے سے اس کے بند پر اوٹھی لیٹی میگزین دیکھنے کے ساتھ ساتھ کچھ گنگنا رہی تھی جس کے ساتھ اس کی اوپر کو انھی پنڈلیاں تھڑک رہی تھیں۔ پرل اسٹریٹ پیٹ کے لوز پانچے ٹانگیں اوپر ہونے کی باعث نیچے ہو گئے تھے۔ اس کی شفاف گوری اور سڈول پنڈلیاں عریاں تھیں۔ خولہ دروازے میں کھڑی رہ گئی۔ ناگوار احساسات سے اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس گھر میں لڑکیاں باپ بھائیوں کے سامنے سر ڈھکے بنا نہیں آ سکتی تھیں اور یہاں بے حیائی کے اس گھٹیا ترین منظر نے اسے منجمد کر ڈالا تھا۔ اسی لمحے تاثیر نے بھی مانیٹر پر سے نگاہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تھا اس کے انداز پر دوسری نگاہ سوئی پر پڑی تھی جو لمحے کے ہزاروں حصے میں بوکھا کر ہٹانی گئی تھی۔

”اندر بے آؤ۔۔۔۔۔ وہاں کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے گہری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے نارمل لہجے میں کہا۔ فیروزی سادہ سوٹ میں اس کی گلابی رنگت میں کچھ ایسی جاؤ بیت اور پاکیزگی کا نور تھا کہ وہ بے ارادہ ہی اس طرف دیکھے گیا۔

”ہینکس گاؤ! تم لہجے آئیں ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا میں بھوک سے مر جاؤں گی۔“ وہ تاثیر کی آواز پر اس کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

”کچھ اور تو نہیں چاہیے؟“ وہ ہر موقع پر بہترین مہمان نواز ثابت ہوئی تھی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ ایک گھنٹے بعد کافی لے آنا۔۔۔۔۔ شاہانہ انداز میں حکم ملا تھا۔

☆☆☆

بڑے ماموں نے نئی برانچ اسلام آباد میں بنائی تھی اور اس کا چارج فیضان نے سنبھالا تھا۔ گھر میں کوئی بھی اسلام آباد سٹیل ہونے کو تیار نہ تھا کہ کراچی جیسی گہما گہمی صرف کراچی میں ہی نظر آتی ہے۔ فیضان کو ویسے بھی ان کی اتنی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گھر میں دادی سے فری تھا

ان کے قریب تھا سو خولہ کے اصرار پر وہ انھیں اپنے ساتھ اسلام آباد لے گیا تھا۔ وہاں جا کر دادی جان از حد خوش تھیں جبکہ گھر میں وہ بے قدری کا شکار تھیں۔

فیضان نے انھیں پورے جنگلے کی حکمرانی سونپ دی تھی۔ پہلی بار انھیں اپنی حیثیت و مرتبے کی شناخت ہوئی تھی۔ ان کا اعتماد اور بردباری لوٹ آئی تھی۔

خولہ بہت خوش تھی۔ اس کی پہلی خواہش تھی وہ انھیں پر اعتماد و با اختیار دیکھنا چاہتی تھی جو فیضان کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ جس کے لیے وہ تہہ دل سے اس کی ممنون تھی اور مطمئن بھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک بار چچھی کو پنجرے سے آزادی نصیب ہو جائے تو وہ آخری سانس تک غلامی و قید کی زندگی نہیں گزار سکتا ہمت و حوصلے سے ہر جال کو کاٹ دیتا ہے۔

”فیضان! تم بہت گریٹ ہو بہت اچھے اتنے پیارے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس دھرتی پر کوئی فرشتہ بھی انسان کے روپ میں موجود ہو سکتا ہے۔“ اس کا فون آیا تو وہ بے اختیار کہہ اٹھی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ پھر بتاؤ بارات لے کر کب آؤں؟“ دوسری جانب سے وہ قہقہہ لگا کر گویا ہوا۔

”شٹ اپ بات کو غلط رنگ مت دیا کرو۔“ غلط نہیں خوشی کا رنگ دے رہا ہوں۔۔۔۔۔ وہ شوخ ہوا۔

”پلیز فیضان! تم مجھے عزیز ہو پسند ہوا اتنی ہی محبت کرتی ہوں میں تم سے جتنی اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو اس سے کرتی۔ شاید وہ بھی مجھے اتنی محبت و اپنائیت کا احساس نہ دے پاتا۔ جیسا تم سے ملا ہے اور ضروری نہیں ہمارا فخر ہمارا مان سکے خون سے ہی وابستہ ہو۔ بے لوث محبتیں ہمیشہ پاسدار ہوتی ہیں۔ اور پھر جو ہمیں معمولی سی بھی اہمیت دے ہمیں چاہے ہمارا خیال رکھے اپنائیت کے یہ مظاہرے تاحیات اس کا گرویدہ بناؤا لتے ہیں۔“ اس کی آواز بھینکنے لگی تھی۔

”اف۔۔۔۔۔ ایک تو تم لڑکیوں میں یہ بھائی بنانے کی عادت بہت گھٹیا ہوتی ہے۔ کر دی نہ ساری محنت برباد سارے خواب بے رنگ کر دیئے۔“ اس نے

مصنوعی خفگی سے کہا۔

”کیوں اپنی نیکیاں برباد کر رہے ہو؟“

”اب تو ممنا کو زارا کے لیے ”ہاں“ کرنا ہی پڑے گی تم نے تو ہری جھنڈی دکھا دی ہے۔“ اس نے خاصے درد بھرے لہجے میں کہا تھا مگر لہجے میں ٹھپسی بشتاشت و شوخی نے اس کے ذہن سے کئی بوجھ اتار پھینکے تھے پھر دادی جان سے کافی دیر بات کر کے اس کے اندر سکون اتر گیا تھا۔

☆☆☆

گھر میں رونق عروج پر تھی۔ چاروں لڑکیاں اپنی سسرالوں سے آئی ہوئی تھیں۔ جن میں سویرا بہت خوش اور مطمئن تھی۔ بلا آخر اس کی فرض شناسی اور صبر رنگ لے آیا تھا سسرال میں اسے وہ مقام مل گیا تھا جس کی وہ تمنائی تھی۔ اس کی چھوٹی نند جو اصل فساد کی جڑ تھی اسے اللہ نے ایسی ہدایت دی کہ نہ صرف اس نے اس کی عزت کرنا شروع کی بلکہ ماں بہنوں کو بھی راہ راست پر لے آئی۔ گھر کے ماحول مزاجوں کے بدلنے سے ہی بدلتے ہیں انھیں حج و غلط کی تمیز ہوئی تو غلط فہمیاں اور بدگمانیوں کا اندھیرا چھٹ کر محبت و یگانگت کی روشنی پھیل گئی تھی۔ مل کر رہنے کا اصل لطف جب ہی آتا ہے جب ہم ایک چھت تلے رہتے ہوئے ایک دوسرے کی پریشانیاں اور خوشیاں سچے دل سے شئیر کریں اور اس کے لیے لازمی ہے کہ ہم بڑوں کا لحاظ و ادب ہر حال میں کریں اور بڑے بھی چھوٹوں سے شفقت و محبت سے پیش آئیں۔ انھیں بہت پیار سے غلط باتوں سے دور رہنے کی تلقین کریں کہ ہمارے مذہب سے ہمیں یہی درس ملتا ہے۔

سویرا خوش تھی دادی جان کی از حد احسان مند تھی کہ انہوں نے بالکل درست موقع پر اسے گائیڈ کیا تھا اگر وہ بھی عام عورتوں کی طرح اسے گھر بیٹھا لیتیں اور سسرال کے خلاف کر دیتیں تو وہ کبھی بھی اصل مسرتوں سے فیضیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے خوش دیکھ کر سب خوش تھے۔

عید پر دادی جان نے تائب اور تبارک کی سنگینوں کا

پروگرام ترتیب دیا تھا۔ سواب دہری تیاریاں ہو رہی تھیں تائبہ اور ہادیہ سلاخیوں میں مصروف تھیں۔ تایا جان چچا جان دادی اور تائی چچی اور چھوٹی امی کے ہمراہ تراویح کے بعد نہ معلوم بند کمرے میں کیا میٹنگیں کر رہے تھے جن میں ایک دن تائبہ نے بھی شرکت کی تھی۔

☆☆☆

”کیا بات ہے ڈیر! بہت خاموش ہو کوئی پر اہلم ہے کیا؟“ سوئی نے آنکسریم کھاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا وہ ہائٹ کاٹن کے سوٹ میں اس کی اجلی اجلی رنگت نمایاں تھی۔

”نہیں..... بھلا مجھے کیا پر اہلم ہو سکتی ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”میری موجودگی میں تمہیں کوئی پر اہلم ہونی بھی نہیں چاہیے۔“ اس نے خاصے اتر کر کہا۔

”کیوں؟“

”میرے تمام بوائے فرینڈز مجھ سے یہی کہتے تھے کہ میری کمپنی میں کوئی بور نہیں ہو سکتا۔“

”کتنے بوائے فرینڈز تھے تمہارے؟“ اس کے اندر پیش سی پھیل گئی تھی۔

”یاد نہیں۔“ اس نے فخر سے کندھے اچکا کر

جواب دیا پھر اس کی جانب در بانی سے دیکھتے ہوئے گویا

ہوئی۔ ”جب میں نے انگل کے پاس تمہاری اسٹیپ

دیکھی تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ پاکستان میں بھی کوئی

بوائے اس قدر بیوی فل ہینڈ سم پرسنالٹی والا ہو سکتا ہے اور

تمہیں دیکھ کر احساس ہوا کہ تم تو تصویر سے بھی بڑھ کر

ہو۔“ اس کے انداز میں اس قدر بے باکی اور خود

اعتمادی تھی کہ لمحے بھر کو وہ بھی پزل ہو گیا تھا۔

”یعنی تم صرف میری خاطر آئی ہو؟“ اس نے

ہونٹوں سے دھواں خارج کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... تمہاری خاطر ہی کلائو کو چھوڑا ہے میں

نے ورنہ اب تک تو ہم میرڈ ہو چکے ہوتے۔ بہت جان

دیتا تھا مجھ پر اور مجھے بھی بہت پسند تھا مگر جب تمہیں

دیکھا تو سب کچھ بھول گئی۔“

”اگر کوئی مجھ سے بھی حسین مل گیا تو کل تم مجھے بھی چھوڑ دو گی؟“ اس کی مسکراہٹ میں کاٹ تھی۔

”کیا تم سے زیادہ کوئی اور خوب صورت ہو سکتا ہے؟“

”ہاں..... حسن مجھ پر تو ختم نہیں ہوتا.....“

”اوہ کم آن! کیا بورنا یک لے کر بیٹھ گئے ہو..... تمہیں اچھی باتیں کرنی نہیں آتیں۔“

اس نے جھنجھلا کر آنسکریم کا خالی کپ نیبل پر رکھا اور پرس میں سے لب اسٹک اور مرمر نکال کر ہونٹوں پر لب اسٹک کا نیا کوڈ پھیر لیا۔

”اگر دادی جان دیکھ لیں تمہیں اس طرح میک اپ میں اس مبارک ماہ میں تو ایسی ڈانٹ پڑے گی کہ پھر کبھی میک اپ کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ گی۔“ اس نے شوخی سے کہا۔

”ماسٹڈ یوسٹر! وہ آپ کی گرینڈ مدر ہیں میری نہیں میں بھی ان کو ایسا جواب دوں گی کہ ڈانٹنا بھول جائیں گی مجھے تو ماما بھی کچھ نہیں کہہ سکتیں۔“ وہ نخوت سے بولی۔

”وہ انکل رضوان کی مہما ہیں تو اس حوالے سے تمہاری بھی گرینڈ مدر ہوئیں۔“

اس کے گستاخانہ انداز پر اس کا دماغ گھوما تھا مگر ریسٹورینٹ کا خیال کر کے ضبط کرنا پڑا۔

”انکل رضوان میرے قادر نہیں ہیں۔ میرے قادر

اس ملک کے سب سے بڑے بزنس مین تھے ان کے

آگے انکل کی کوئی ویلیو نہیں ہے۔ انہوں نے میرے قادر

کی دولت پر قبضہ جمانے کے لیے ماما سے شادی کی تھی

اور اس وقت کاروباری دشمنوں کی وجہ سے ماما کو مضبوط

سہارے کی ضرورت تھی چنانچہ ماما نے مجبوری میں ان

سے شادی کی اور جاپان چلی گئیں۔“

”چلو تمہیں گھر ڈراپ کر دوں.....“ اس سے ضبط نہ

ہوا تو بھٹا کراٹھ کھڑا ہوا۔

اس کا بگڑا ہوا میوڈ اور سرخ چہرہ دیکھ کر اسے احساس

ہوا کہ وہ بابل رہی تھی مگر وہ کیا کرتی کہ اس نے رضوان

صاحب کو کبھی عزت دی ہی نہ تھی۔ وہ اس کے لیے کبھی

بھی قابل احترام نہیں رہے تھے۔

راستہ بالکل خاموشی سے کٹتا تھا۔ وہاں جا کر مسز رضوان نے اسے زبردستی روک لیا تھا۔

”بیٹا! کافی پی کر جانا مجھے معلوم ہے اس سر پھری لڑکی

نے اتنے سرد موسم میں بھی آنسکریم پسند کی ہوگی بیٹھ جاؤ

ملازمہ کافی لارہی ہے۔“ انہوں نے زبردستی اسے بٹھایا تھا۔

”جاپان سے احمد کی کال آئی ہے اس کی وائف کے

ڈیویری ہونے والی ہے اس نے ہمیں بلایا ہے۔ ہمیں جلد

ہی جانا ہوگا دوبارہ اتنی جلدی کہاں آنا ہوگا۔ میں چاہتی

ہوں آپ جلد ہی اپنے گھر والوں کو بھیجیں تاکہ جلد سوئی

سے فارغ ہو کر ہم جائیں۔“

”گھر والوں کی آمد سے سوئی کی فراغت کا کیا تعلق ہے؟“

”آپ کے ہاں سے پریوزل آئے گا تب ہی تو میں

سوئی سے آپ کی شادی کروں گی۔“

”آپ سے کس نے کہا کہ میں سوئی سے شادی کروں گا؟“

”کیا..... کیا کہہ رہے ہیں بیٹا؟ سوئی کے ساتھ اس

قدراندر اسٹینڈنگ اور.....“

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے آنٹی! میں نے تو مہمان

نوازی نبھائی تھی حیرت ہے اتنے ایڈوانس ماحول میں موو

کرنے کے باوجود آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں سوئی

سے شادی کروں گا۔“

”لیکن..... لیکن میں نے تو جاپان میں احمد سے آپ

کے لیے فرم خریدنے کے بات کی ہے تاکہ آپ بھی

جاپان جا کر دولت کما سکیں یہاں کیا رکھا ہے پھر سوئی

آدھی جائداد کی خود مالک ہے۔“

”دولت کی مجھے یہاں بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ بہت

جلد میں اپنی نئی فرم کا افتتاح کرنے والا ہوں تایا جان

نے بہترین علاقے میں سب کی کوٹھیاں الگ الگ

خریدی ہیں جو اب تعمیر کے آخری مراحل میں ہیں۔

ویسے بھی مردوں کو اپنے قوت بازو کی کمائی پر گزارا کرنے

کی عادت ہوئی چاہیے ورنہ اس میں اور گلی کے آوارہ کتے

میں کوئی فرق نہیں رہتا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے دو ٹوک

لجے میں کہا۔

”وہ سب سوئی کی سنگت کا اثر تھا شاید اب ان لوگوں میں کچھ ان بن ہو گئی ہے جو نہ وہ آرہی ہے اسے بھی گھر والوں کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو تاثیر! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ سوئی جو سکتے کی کیفیت میں اس کی باتیں سن رہی تھی تڑپ کر گویا ہوئی۔

”چلو بچیو! سو جاؤ بہت وقت ہو گیا ہے پھر سحری میں اٹھنے میں پریشانی ہوگی۔“ تائی امی وہاں سے گزریں تو روشنی دیکھ کر بچن میں آ کر ان سے مخاطب ہوئیں۔

”میں نے ابھی بھی تمہیں سہانے خواب نہیں دکھائے اس لیے تم مجھے الزم نہیں دے سکتیں اور ایک بات یہ ہم مردوں کا المیہ ہے کہ ہم کتنے ہی ماؤرن کیوں نہ ہو جائیں مگر اپنے سے وابستہ رشتوں کو کھر اور شفاف دیکھنا پسند کرتے ہیں اور کچھ دیر قبل جو تم نے دادی جان اور انکل کی شان میں گستاخی کی ہے تمہاری اس بد تمیزی نے تمہیں میرے دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال پھینکا ہے تمہاری رسائی اب میرے خیالوں تک بھی ناممکن ہے۔“ ملازمہ کافی لے آئی تھی مگر وہ رکا نہیں سیدھا گیسٹ کی سمت بڑھ گیا۔

☆☆☆

رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ بالکل غیر متوقع طور پر اس نے سنا کہ تاثیر نے اس سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس کا تو غم و غصے سے برا حال ہو گیا یہ سن کر مگر ایک طرح سے اسے خوشی بھی ہوئی تھی کہ بڑوں کی طرف سے اس پر کوئی زبردستی نہیں تھی۔ مگر گھر کی تمام لڑکیوں کی یہی کوشش تھی کہ وہ تاثیر کو معاف کر دے۔ اور وہ ایسی کسی سخاوت اور دریادلی کے مظاہرے کے لیے تیار نہیں تھی۔

خضر فیروز کا رشتہ ہادیہ کے لیے آیا اور دادی جان نے فوراً ہی منظور کر لیا کیونکہ وہ دیکھے بھالے لوگ تھے۔ ہادیہ کو حیرت تھی کہ بھلا اس کو اس میں ایسی کیا خوبی نظر آئی تھی جو اس نے اسے پسند کیا تھا حالانکہ اس دن غصے میں اس سے خاصی بد تمیزی سرزد ہو گئی تھی کہ وہ اسے کوئی فقیر سمجھ کر دھتکار چکی تھی۔ وہ کسی کام سے کراچی آیا تھا اور دو دن یہاں رہا تھا۔ اور بہانے بہانے سے اپنے پاس خاصے بھاری نوٹوں کی موجودگی کا احساس دلاتا رہا تھا۔ آج کل وہ ان کی چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔

”میں بھلا کس طرح اس مکمل شخص کا ساتھ دے سکتی ہوں۔ میری خواہش اور جذبات تشنہ ہیں میرا ہر عمل ادھورا ہوتا ہے میری ذات کی طرح میں ہمیشہ کی غاصب شیریں اور دوسروں کی محبتوں میں جھسے بٹورنے والی اس قابل کہاں ہوں۔“ شرہ اور ہادیہ کے بار بار کہنے پر وہ سخت لجے میں بولی۔

”خول! تم نے ایک تبدیلی نوٹ کی؟“ وہ بچن صاف کر کے ہاتھ دھو رہی تھی کہ تائبہ نے برتن کیمین میں لگاتے ہوئے کہا۔

”تمہاری ادھوری ذات ان کا ساتھ پا کر مکمل ہو جائے گی فکر کیوں کرتی ہوں۔“ نو پریش کر بولی۔

”کون سی تبدیلی؟“

”تم لوگوں سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ وہ بھنا کر لاؤنج سے نکلی تھی اور اندر آتے ہوئے تاثیر سے پوری شدت سے ٹکرائی تھی۔

”تاثیر کا آفس کے بعد کا سارا وقت اب گھر میں گزرنے لگا ہے۔“

”آ نکھیں بھی کمزور ہو گئی ہیں کیا تمہاری؟“ اس نے پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔ جواباً وہ خاموش رہی اور جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

”ہاں۔۔۔ آج کل چھوٹی امی اور دادی جان بہت خوش ہیں ورنہ کچھ عرصے سے وہ انھیں فراموش کر بیٹھا تھا۔“

چھبیسویں شب کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔
 ”نہیں.....“ اس کی سپاٹ آواز میں کوئی ایسی بات
 ضرور تھی جس کے احساس سے تاثیر کے لبوں پر
 مسکراہٹ مل بھر کو چمک کر معدوم ہو گئی۔

”تم نے فیضان کی خاطر مجھے ریجیکٹ کیا تھا جب
 کہ.....“

”پلیز میں اس ٹاپک پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتی اور
 آپ کو فیضان کے بارے میں کسی بھی گھٹیا انداز میں
 سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے تیزی سے کہہ کر
 آگے بڑھنا چاہا کہ اسی لمحے اس نے آگے بڑھ کر اس کا
 ہاتھ پکڑ لیا۔

”بات سنو میری پھر جاننا یہ درست ہے کہ مجھے تم سے
 پہلے بہت ساری شکایتیں تھیں، شکوے تھے مگر باشعور
 ہونے کے بعد مجھے اپنے رویے پر شرمندگی تھی میں نے
 خود کو کافی حد تک بدلا اور زیادہ تر کوشش کی کہ کوئی ایسی
 بات نہ کروں جس سے تمہیں تکلیف ہو۔“

”مجھے تو کوئی ایسی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔“ اس نے
 کھٹ سے جواب دیا۔

”محسوس کرنے سے ہر بات محسوس ہوتی ہے اور تم
 میں ایسی حس کہاں ہے۔“

”ہاں..... میں تو ہوں ہی بے حس اور ادھوری.....“
 ”پلیز..... پلیز! مجھے سمجھنے کے کوشش کرو مجھے

اعتراف ہے کہ مجھے یہ غلط فہمی شروع سے ہی تھی کہ تم
 فیضان میں انٹرنشڈ ہو اور یہ خیال میرے اندر ایسی آگ
 سی بھڑکا دیا کرتا تھا کہ اس کی پیش میں مبتلا ہو کر میں تم
 سے زیادتی کر جایا کرتا تھا۔“ چند لمحے خاموش رہ کر اس
 نے اس کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھا پھر گویا ہوا۔

”اسی فرسٹریشن کا شکار ہو کر میں سوئی کی طرف بڑھا
 تھا پہلے پہل اس کا ساتھ مجھے بہت اچھا لگا مگر بہت جلد
 اس کی بے باک فطرت اور آزاد خیال طبیعت نے مجھے
 بے چین و بددل کر دیا پھر بالکل غیر ارادی طور پر تمہارا اور
 اس کا موازنہ کیا کہ ہم سالوں سے ساتھ رہتے آ رہے

ہیں جن میں بے شمار موقعے تنہائی کے بھی ملے ہیں اور
 اس دوران ہمارے درمیان کوئی چپ حرکت ہونا تو
 درکنار ہم ایک دوسرے کو نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔
 مگر سوئی..... خیر اس کے سنگ رہ کر میں نے جانا کہ حیا و
 لجاجت بے حیائی دے غیرتی میں کیا فرق ہوتا ہے.....
 اور سب سے زیادہ پاور فل احساس یہ ہوا کہ..... اس نے
 بھر پور نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں
 تمہارے وجود کا اتنا عادی ہو گیا ہوں کہ تصور میں بھی تم
 سے جدائی برداشت نہیں ہو سکتی.....“ اس کے بھاری
 لہجے میں جذباتوں کے ان گنت پھول کھلے ہوئے تھے۔
 ”مجھے معلوم ہے یہ کوئی نیا پلان ہے مجھے بیوقوف

بنانے کا۔“
 ”تم نہیں سدھر سکتیں۔“ اس کا دماغ ایک دم ہی گھوما
 تھا۔ ”تمہیں معلوم ہے مجھ سے کوئی زبردستی اپنی بات نہیں
 منا سکتا۔ میں نے پہلے فیضان سے فون کر کے معلوم کیا
 تھا۔ وہاں سے اوکے کا سگنل پا کر میں نے دادی جان اور
 تایا جان وغیرہ سے تمہارے لیے ہائی بھری تھی۔ ورنہ تایا
 جان تو دادی کو منا چکے تھے سوئی کو بہو بنانے کے لیے۔
 میری بات پر یقین نہ آئے تو ان سے معلوم کر لو انہوں
 نے اس شرط کے ساتھ ہائی بھری تھی کہ میں نے تمہارا دل
 دکھایا ہے سو مجھے ہی تمہیں منانا بھی پڑے گا۔“

”اگر میں نہ مانوں تو؟“ اس نے دھیمے سے کہا۔
 ”تو تمہیں یہاں سے دھکا دے کر خود بھی چھلانگ
 مار لوں گا۔“

”زبردستی ہے کیا؟“
 ”بالکل دیکھا، سچی بات کڑوی تو ہوتی ہے مگر تاثیر شہد
 کی رکھتی ہے۔ اس دن میری باتوں نے تمہیں زک تو
 پہنچائی ہے مگر تمہیں مکمل بھی کر دیا ہے اس لیے کہ اس دن
 کے بعد سے تم نے کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑا ہے۔“ اس
 نے شرارت سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

”میں چاہتا ہوں یہ عید تمہاری زندگی کی مسرتوں سے
 لبریز یادگار عید ہو جسے تم تاحیات نہ بھلا سکو۔ آج سے

تمہارے تمام دکھ میرے اور میری تمام خوشیاں تمہاری
دراصل تمہاری بے لوث محبت نے ہی کے ساتھ ساتھ
مجھے بھی مسخر کر لیا ہے۔

”کہاں تو تو ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے کے بھی
روادار نہ تھے یا یہ عالم ہے کہ راز و نیاز ختم ہونے میں نہیں
آ رہے نیچے چلیں فیضانِ چچا آئے ہیں۔“ ہادیہ نے وہاں
آ کر کھری کھری سنائی تھیں۔

”میں سحرش کا گنہ گار ہوں اماں! مجھے میرے گناہوں
کی بہت سزا ملی ہے۔ سحرش کی موجودگی میں میں نے
عافیہ سے نکاح دولت کے لالچ میں یہ تھا۔ مگر یہاں سے
ہی میری بد نصیبیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ
جاپان چلا گیا اور وہاں جا کر مجھے معصوم ہوا کہ جسے میں
نے بے بس ساتھ بیوہ سمجھ کر نکاح کیا تھا وہ بہت بڑی
شاطر اور مکار عورت ہے اور از حد نجس بھی وہاں جاتے
ہی اس نے میرا سپورٹ اپنے قبضے میں کر لیا۔ رات دن
مجھے مشین کی طرح کام کرنا پڑتا تھا۔ پیسہ تو میرے ہاتھ
میں بالکل بھی نہیں دیتی تھی فون پر بھی آپ لوگوں سے
بات بھی اتفاقاً ہی ہوتی تھی جب وہ کسی وجہ سے میرے
سر پر سوار نہ ہوتی تھی آپ کی دعا میں بھی تھیں جو سوئی
کی وجہ سے وہ یہاں آنے پر تیار ہوتی تو مجبوراً مجھے بھی
ساتھ لانا پڑا اور اس پر بھی یہ شرط تھی کہ میں اپنی بیٹی سے
نہیں ملوں گا۔“ فیضان اماں کے قدموں میں بیٹھے
رورے تھے اور کہہ رہے تھے۔

”میں جو اسے برسوں سے دیکھتے سینے سے لگانے کی
آرزو لیے جی رہا تھا عزت کی خاطر یہ وار بھی سہہ گیا مگر
اب میرے صبر کی طنائیں ٹوٹ گئیں جب ان ماں بچی
نے مجھے مجبور کرنا چاہا کہ میں یہاں آ کر تباشر کو رانسی
کروں سوئی سے شادی کرنے پر اور میں لغت بیچ کر
آ گیا ان کی بے مول غلامی پر میں نے بہت سزا کائی ہے
اماں! کیا آپ کے قدموں میں جہ ملے گی مجھے؟ کیا
میری بیٹی اور میرے اپنے مجھے معاف کر دیں گے؟ بہت
خطا وار ہوں میں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے تو اماں

نے جیسے آنسوؤں سمیت انھیں سینے سے لگا کر کہا۔
”یہ گھر تمہارا ہے سب تمہارے اپنے ہیں کوئی تم سے خفا
نہیں ہے اور خولہ کس طرح باپ سے ناراض رہ سکتی ہے۔“
تایا خولہ کا ہاتھ پکڑ کر ان کی طرف لے آئے تو باپ
کے کشادہ سینے سے لگ کر اس نے اتنے آنسو بہائے کہ
تمام نشئی اور برسوں کا غبار دھل کر صاف ہو گیا۔

☆☆☆

عید کا چاند نظر آ گیا تھا ہر سو خوشیوں اور شادمانیوں
کے رنگ چمک اٹھے تھے۔ گھر میں نئے سرے سے
رنگاے جاگ اٹھے تھے۔ گھر کی خواتین کچن سنبھال چکی
تھیں۔ وہ سب چوڑیوں اور مہندی کے چکروں میں الجھ
رہی تھیں۔

”خولہ! کیا کر رہی ہو بیٹا!“ چھوٹی امی اسے وارڈروب
میں گھسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔
”کل پہننے کے لیے سوٹ دیکھ رہی ہوں یہیں رکھا
تھا مگر اب نہیں مل رہا۔“

”مل جائے گا برسوں پہن لینا۔ کل پہلی عید ہے
تباشر کے ساتھ جا کر کوئی خوب صورت سا سوٹ لے کر
آؤ اور میچنگ کی ہر چیز لے کر آنا۔“ اس کے انکار سے
قبل ہی انہوں نے تباشر کو آواز دی تھی جو فوراً چلا آیا تھا۔
چاند رات کی رونق عروج پر تھی۔ رنگ برنگی روشیناں
ہر سو بکھری ہوئی تھیں۔ تباشر کے ہمراہ فرنٹ سیٹ پر وہ
خاصی زروس سی بیٹھی ہوئی تھی۔

تباشر کے چہرے پر الوہی مسرتوں کی روشنی تھی وہ
جدبے لٹائی نگاہوں سے بار بار اسے دیکھ کر گنگنا رہا تھا۔
عید کا چاند آج دیکھا ہے
ہر کلی یوں ہی سدا ہی مسکرائے
ہاتھ اٹھا کر دُعا کرتا ہوں
کاش ایسی عید بار بار آئے

